ماہ رُخ



رضیہ بٹ

بسم الله الرحمن الرحيم

ماہ رُخ

رضیہ بٹ

مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

اہتمام

ڈاکٹر ظفر مقبول

مقبول اکیڈمی

۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

قیمت: [redacted] روپے

پرنٹرز: معظم پرنٹرز۔ لاہور

اُن

معصوم کلیوں کے نام

جو

میرے گلشنِ حیات میں

مہک رہی ہیں ——

ترتیب

سبز رنگ	۹
اُف یہ مرد	۳۲
ساڑھی	۴۷
پہلی تاریخ	۶۴
بھول	۸۷
تلخیاں	۱۱۳
بوجھ (۱۹۴۴ء)	۱۵۳
ماہ رُخ	۱۹۳

سبز رنگ

کمرے کی دیواروں پر سبز ڈسٹمپر ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کا روغن سبز ہے پردے، قالین اور فوم کا خوبصورت بیڈ بھی سبز رنگ کے مختلف شیڈوں میں ہے۔ گدے دار کرسیاں بھی سبزی مائل ہیں۔ آئینے والی بڑی سی الماری کا رنگ بھی ہلکا سبز ہے۔

ساحرہ سبز پتوں والی فرنچ شیفون کی خوبصورت ساڑھی پہنے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے حسین خدوخال کا جائزہ لے رہی ہے۔ ریشمی جھالروں والے بیڈ پر اس کا ہلکا گلابی لباس بکھرا پڑا ہے جسے اس کی ملازمہ سانولی تہہ کر رہی ہے۔

ساحرہ: (بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے) یہ کپڑے گودام میں میرے کالے سوٹ کیس میں رکھ آؤ سانولی ـــــ آئندہ سبز رنگ کے بغیر میرے اور کسی رنگ کے کپڑے نہ نکالا کرو۔

سانولی: کیوں بیگم صاحب جی!

ساحرہ: (چہرے پر ناخوش گوار سے تاثرات ہیں) بس ـــــ

سانولی: (پلٹ کر ساحرہ کو دیکھتے ہوئے) مجھے تو یہ سوٹ پسند آیا تھا بیگم صاحب جی۔ کتنا پیارا رنگ ہے۔ اس ساڑھی سے تو یہ سوٹ پہن لیتیں۔ صاحب جی آرہے ہیں۔ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔

ساحرہ: صاحب جی اس سوٹ کو دیکھ دیکھ کر باغ باغ نہیں ہوتے۔

سانولی: کیوں جی — کیسا پھبتا یہ رنگ آپ کے چہرے پر۔

ساحرہ: اوہ — سانولی — اتنے دن ہو گئے یہاں آئے ہوئے، تجھے ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ صاحب بہادر کو سوائے رنگ کے دنیا کا اور کوئی رنگ پسند ہی نہیں۔

سانولی: (مسکرا کر) ہائے اللہ۔ میں بھی کہوں — گھر کی ہر چیز سبز رنگ کی کیوں ہے۔

ساحرہ: یہ ہمارے صاحب بہادر کی والہانہ پسند ہے۔

سانولی: کمروں کی چیزیں تو سبز رنگ کی اچھی لگتی ہیں۔ لیکن آپ کا لباس صبح و شام ایک ہی رنگ کا — جچتا نہیں بیگم صاحب جی — دل تنگ نہیں آتا آپ کا۔

ساحرہ: (گہری آہ بھر کر) دل تنگ آنے کا کہتی ہو — (جھلا کر) مجھے تو صبح و شام یہ رنگ استعمال کر کر کے اس سے شدید نفرت ہو گئی ہے۔ کپڑے سبز۔ کمرے سبز بستر سبز — کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں۔ جس میں یہ واہیات رنگ نمایاں نہ ہو۔

سانولی: صاحب جی کو اتنا پسند ہے یہ رنگ۔

ساحرہ: پسند! انہیں تو عشق ہے اس رنگ سے۔ سال ہونے کو آیا میری شادی کو۔ ہر طرف سبز ہی سبز رنگ دیکھتے طبیعت اکتا چکی۔ لیکن وہ ہیں کہ والہانہ پن میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

سانولی: جہیز کے کپڑے تو سبز رنگ کے نہیں تھے آپ کے۔

ساحرہ: اسی لیے تو ویسے کے ویسے پڑے ہیں۔ کتنے چاؤ سے بنوائے تھے میں نے اپنے لباس — یہ (گلابی کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے) رنگ تو میرا دل پسند رنگ تھا۔ لیکن اب تو اسے صرف اماں کے گھر جاؤں تو پہن سکتی ہوں — وہ بھی جب اکیلے جاؤں۔

سانولی: ویسے سبز رنگ آپ پر کھلتا خوب ہے بیگم صاحب جی۔

ساحرہ: رہنے دے سانولی۔ جہنم گیا رنگ کا کھلنا — مجھے تو اس رنگ کو دیکھ

کرسٹلی آنے لگتی ہے۔

سانولی: صاحب جی سے کہہ دیں۔ نہ پہنا کریں۔

ساحرہ: اوہ — تو نہیں سمجھ سکتی سانولی — میری مجبوری کو — جی تو میرا بھی چاہتا ہے۔ نہ پہنا کروں یہ رنگ — لیکن صاحب بڑے نازک مزاج ہیں۔ ان کی پسند کا احترام ہے۔ ورنہ —

سانولی: بڑی ہمت ہے آپ کی۔

ساحرہ: (ہنس کر) یہ ہمت کسی دن اچانک جواب دے جائے گی۔ اب تو اس رنگ کو برداشت کرنا مشکل لگتا ہے۔

سانولی: چلو — کیا ہوا بیگم صاحب بھی — صاحب جی کو پسند ہے۔ بیوی شوہر کی پسند کا کھائے پہنے تو اچھا ہوتا ہے۔

ساحرہ: (گہری آہ بھر کر) اچھا سانولی — اب تم تہہ کر بھی ڈالو ان کپڑوں کو — (گھڑی دیکھ کر) جہاز کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ سانولی جلدی کرو۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔

سانولی: (کپڑے اٹھاتے ہوئے) دس بجے کے جہاز سے آرہے ہیں نا صاحب۔

ساحرہ: ہاں۔

سانولی: وقت ہو گیا ہے۔

ساحرہ: ہاں — جلدی جاؤ — ڈرائیور کو دیکھو۔ یہیں ہے نا —

(سانولی بہت اچھا کہہ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ ساحرہ آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتی ہے —)

ساحرہ: (اپنے آپ سے) سبز ساڑھیاں۔ سبز غرارے۔ سبز پاجامے کرتی۔ سبز شلوار قمیض — اُف (سر پکڑ لیتی ہے) حد ہو گئی جنون کی کتنی اکتاہٹ ہوتی ہے اس رنگ سے — (ادھر ادھر دیکھ کر) سارا گھر سبز رنگ میں ڈوبا ہوتا ہے۔ گھر نہ ہوا مزار ہو گیا — ہونہہ — کب تک جبر کروں گی اپنے آپ پر۔ میری پسند تو

جیسے کچھ ہے ہی نہیں ۔ زبردستی مسلط کیے جاتے ہیں اپنی پسند مجھ پر ـــــ (چہرے پر ناخوشگوار تاثرات بڑے واضح نظر آنے لگتے ہیں ـــــ) انسان ہوں میں بھی ۔ پتھر تو نہیں ـــــ بڑے آئے ـــــ ہونھ ـــــ

(سالوُلی اندر آتی ہے)

سالوُلی: بیگم صاحب جی گاڑی نکال دی ڈرائیور نے ۔

ساحرہ : (جھلایا ہوا پریشان چہرہ) بہت اچھا ـــــ آتی ہوں ابھی ـــــ

(سالوُلی اس کا منہ دیکھنے لگتی ہے ۔ ساحرہ اپنا سبز رنگ کا پرس اٹھاتی ہے اور کمرے سے باہر نکل جاتی ہے) ۔

ـــــــــــ ... ـــــــــــ

ڈرائنگ روم۔ آراستہ و پیراستہ۔ لیکن ہر چیز سبز رنگ کے کسی نہ کسی شیڈ میں ہے۔ ہلکے سبز رنگ کے فوم کے صوفے پر گہرے سبز رنگ کے کپڑے پہنے ساحرہ بیٹھی ہے۔ قریب ہی براؤن سوٹ میں ملبوس نسیم بیٹھا ہے۔ خوش رُو صحت مند اور خوش مزاج نوجوان ہے۔ ساحرہ کے سامنے ٹرالی پر چائے کا سامان رکھا ہے۔ ساحرہ چائے بنا رہی ہے۔ نسیم محبت بھری نظروں سے ساحرہ کو دیکھ رہا ہے —)

ساحرہ: (ادائے ناز سے) کیا ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہے ہیں۔

نسیم: خدا قسم سبز پتوں میں گھرا گلاب کا پھول لگ رہی ہو۔

ساحرہ: (ساحرہ خوش ہونے کی بجائے کچھ جھنجھلا جاتی ہے) چائے لیجئے۔

نسیم: شام ہوائی اڈے پر سبز ساڑھی میں تمھیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ تمھیں میری پسند کا کتنا احترام ہے۔

ساحرہ: پہلے کیا کم سبز رنگ کی ساڑھیاں ہیں میرے پاس۔ جو ایک اور اٹھا لائیے۔

نسیم: (شائستگی سے) لیکن اس میں غصہ میں آجانے کی کیا بات ہے؟

ساحرہ: تو کیا خوشیاں مناؤں۔

نسیم: ساحرہ —— تم ساڑھی کا کپڑا تو دیکھو۔ کتنی نفیس چیز ہے۔

ساحرہ: جہنم میں جائے نفیس چیز —— (غصّے سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے) تنگ آگئی ہوں میں اس رنگ سے۔

نسیم: ساحرہ —!

ساحرہ: (غصے سے جُز بُز ہوتے ہوئے) نہیں چاہیئے مجھے یہ ساڑھی۔ سبز رنگ۔ سبز رنگ — سبز رنگ — (سر پکڑ لیتی ہے) اُف!

نسیم: (شوق اور چاہت مجروح ہوتے ہیں) تمہیں ہو کیا رہا ہے۔

ساحرہ: (دیوانگی کے سے انداز میں) نہیں چاہیئے مجھے یہ ساڑھی۔ آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے۔ اپنی پسندیوں ٹھونسے جاتے ہیں جیسے میں پتھر ہوں۔ ہر طرف سبز ہی سبز رنگ دیکھتے دل خراب ہونے لگتا ہے۔ پہلے کیا کم تھے۔ اس رنگ کے کپڑے جو یہ اور اٹھا لائے ہیں۔ نہیں پہنوں گی نہیں پہنوں گی — (سر پکڑ لیتی ہے) میں یہ ساڑھی نہیں پہنوں گی۔

نسیم: (ہراساں اسے دیکھتا ہے) ساحرہ — تمہیں ساڑھی پسند نہیں کم از کم میرے شوق اور جذبے کا ہی خیال رکھا ہوتا — کتنے ارمان سے خریدی ہے میں نے یہ ساڑھی۔

ساحرہ: بس نہیں پہنوں گی — نہیں پہنوں گی۔ پسند کو وبالِ جان بنا رکھا ہے۔ آپ نے — عذاب میں جان آگئی ہے۔

نسیم: (غصے میں آ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) اتنے عذاب میں تھیں۔ تو پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔

ساحرہ: (اس کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر) حد بھی ہوتی ہے کس بات کی۔ (غصے سے ساڑھی اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر نسیم کی طرف پھینک دیتی ہے)

نسیم: (ٹھوکر مار کر ساڑھی کو قالین پر بکھیر دیتا ہے —) دیا سلائی دکھا دو اسے۔ (غصے میں تیزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

ساحرہ: میری تو جیسے پسند ہے ہی نہیں۔ مزاج ہی بگڑ گیا — بگڑا ہے۔ میں بھی اب کبھی یہ رنگ نہیں پہنوں گی — نہیں پہنوں گی — نہیں پہنوں گی۔ (اٹھ کر ساڑھی کو لپیٹ کر صوفے پر دے مارتی ہے) اور جوشِ جذبات سے آنسو بہانے لگتی ہے)

(وہی ڈرائنگ روم ۔ ساڑھی صوفے پر پھیلی پڑی ہے ۔ سہ پہر ڈھل رہی ہے ۔
ساحرہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی ہے ۔ آنکھیں متورم ہیں ۔ صبح والے سبز لباس
میں ہے ۔ لیکن چہرہ اداس اور ویران ہے)

ساحرہ : (صوفے پر گرتے ہوئے) ساونلی — اے ساونلی ۔

ساونلی کی آواز : جی بیگم صاحب جی ۔

ساحرہ : بات سُن ۔

(ساونلی ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے)

ساونلی : جی ۔

ساحرہ : صاحب نہیں ابھی تک ۔

ساونلی : جی نہیں ۔

ساحرہ : پتہ نہیں کہاں گئے ۔ کھانا کھانے بھی نہیں آئے ۔

ساونلی : آپ تو کھا لیتیں بیگم صاحب جی ۔ اب تو چار بجنے والے ہیں ۔

ساحرہ : (سر نفی کے انداز میں ہلاتی ہے ۔)

ساونلی : صاحب کو کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا ۔ دس دن باہر رہے ہیں ۔ کام
کی دیکھ بھال میں لگے ہوں گے ۔ آپ کھانا کھائیں (ذرا چپ رہ کر) لگادوں کھانا ۔

ساحرہ : (گھبراہٹ اور پریشانی سے) نہیں — جب تک نسیم نہیں آئیں گے ۔

میں نہیں کھاؤں گی۔

سانولی: وہ تو اب رات ہی کو آئیں گے۔ دفتر میں کام ـــ

ساحرہ: وہ دفتر میں نہیں ہیں۔ میں دو تین بار ٹیلی فون کر چکی ہوں۔

سانولی: ہوٹل گئے ہوں گے۔

ساحرہ: نہیں، سانولی نہیں ـــ وہ ـــ وہ ـــ صبح ناراض ہو ـــ کر گئے ہیں۔

(سانولی کے پوچھنے سے پہلے ہی ساحرہ کی عزیز ترین سہیلی اسماء اندر داخل ہوتی ہے)

اسماء: (مسکراتے ہوئے) کون ناراض ہو کر گیا۔

ساحرہ: اوہ تم ـــ اسماء آؤ ـــ (اٹھ کر استقبال کرتی ہے ـــ) بڑے دنوں بعد آئیں۔

اسماء: تمہاری طرح بیکار کی روٹیاں تھوڑا ہی توڑتی ہوں۔ ایک عدد شوہر اور دو عدد بچوں کو بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔

(دونوں صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں)

ساحرہ: (سانولی سے) جاؤ چائے تیار کرو۔

سانولی: اچھا بیگم صاحب جی (چلی جاتی ہے)

اسماء: (سانولی کی طرف اشارہ کرکے) یہ رنگروٹ ـــ

ساحرہ: (مسکرانے کی کوشش میں) امی نے بھجوادی ہے۔ بڑا کام کرتی ہے۔

اسماء: یہ خیر سے آنکھیں کیوں لال انگارہ ہو رہی ہیں۔ رو رہی تھیں۔

ساحرہ: (جھجک کر) نہیں ـــ نہیں ـــ تو۔

اسماء: بکو نہیں ـــ کیا ہوا؟

ساحرہ: کچھ بھی تو نہیں ـــ (سر جھکا کر انگلی پر آنچل لپیٹتے ہوئے افسردہ ہو جاتی ہے۔)

اسماء: کچھ تو ہے ـــ آخر ایسی بھی پردہ داری کیا ـــ پریشان نظر آ رہی ہو ـــ

آنکھیں بھی سوجی ہوئی ہیں — اب تم کچھ بتانا نہ چاہو تو دوسری بات ہے۔

ساحرہ: اسماء سچ کہتی ہوں۔ بات کچھ بھی نہیں —

اسماء: نسیم سے لڑائی ہو گئی ہوگی۔

ساحرہ: (سر جھکا کر) بس—

اسماء: بس کیا۔ ابھی اپنی نوکرانی سے تم نسیم ہی کے متعلق کہہ رہی ہوگی۔

ساحرہ: (مغموم مسکراہٹ) ہاں۔

اسماء: ہوا کیا؟

ساحرہ: بہت معمولی سی بات۔

اسماء: پھر بھی۔

ساحرہ: (گہری آہ بھر کر) بس اس موئے سبز رنگ کی وجہ سے لڑائی ہو گئی۔

اسماء: سبز رنگ نسیم کو پسند ہے۔

ساحرہ: دیوانگی کی حد تک۔

اسماء: پھر۔

ساحرہ: جتنا انہیں پسند ہے — اتنا ہی مجھے اس رنگ سے چڑ ہوتی جا رہی ہے۔ (آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں) حد بھی تو ہوتی ہے اسماء۔ سال بھر ہو رہا ہے شادی کو — صبح و شام یہی مردار رنگ دیکھتے آنکھیں دکھ گئی ہیں۔ گھر کی ہر چیز سبز — میرا ہر لباس سبز — اس پر کل کراچی سے یہ نئی سبز ساڑھی اٹھا لائے — بس مجھے تو دیکھ کر آگ ہی لگ گئی۔

اسماء: آگ لگنے کی بات تو کوئی نہیں۔

ساحرہ: یہ تم کہتی ہو نا — میری جگہ ہوتیں تو دل پھٹ جاتا۔

اسماء: اوہو — اتنا ہی تنگ آ گئی ہو۔

ساحرہ: بس آج تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہی ہو گیا۔

اسماء: (حیرانگی سے) اتنی سی بات پر لڑ پڑیں نسیم سے۔

ساحرہ: یہ اتنی سی بات ہے؟

اسماء: ایسی سنجیدہ بھی نہیں ـــــ شوہر کی پسند کا احترام اچھی بیوی کا فرض ہے۔

ساحرہ: ہونھہ۔

اسماء: اور خاص کر نسیم جیسے شوہر کی پسند کا احترام۔

ساحرہ: لیکن ـــــ

اسماء: لیکن کیا؟ تمھیں نسیم جیسا شوہر ملا ہے ساحرہ ـــــ تمھیں تو اپنی خوش بختی پر نازاں ہونا چاہیئے۔ تمھارے آرام و آسائش کا جس طرح وہ خیال رکھتا ہے۔ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں۔

ساحرہ: (کچھ کتراتے ہوئے) میں کب انکار کرتی ہوں۔

اسماء: پھر اتنی سی بات پر اس کی دل شکنی کیوں کی؟

ساحرہ: پھر وہی اتنی سی بات ـــــ میرے جذبات کو بھی تو دیکھو۔ دل تنگ نہیں آجاتا کیا؟

اسماء: دل تنگ آجانے کا یہ مطلب تو نہیں۔ کہ تم پنجے جھاڑ کر شوہر کے پیچھے ہی پڑ جاؤ۔ کس خواہش اور چاہت سے وہ بیچارہ یہ ساڑھی لایا ہوگا۔ تم نے اس کا دل توڑ دیا۔

ساحرہ: (کچھ کٹتے ہوئے) اس وقت خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا ـــــ اب افسوس ہو رہا ہے ـــــ مجھے ان سے اس طرح پیش نہیں آنا چاہیئے تھا۔ وہ ـــــ آج ـــــ کھانا ـــــ کھانے بھی گھر نہیں آئے۔

اسماء: ذرا دماغ شریف سے کام لے لیا کرو تا ـــــ ایک دم جذباتی ہو جاتی ہو ـــــ ذرا سی بات پر شوہر کو ناراض کر دیا۔ اس کی دل شکنی کر دی۔

ساحرہ: تو ـــــ میں کیا کرتی ـــــ تمھیں کہہ چکی نا ـــــ مجھے اس سبز رنگ سے چڑ ہو گئی ہے۔ برداشت نہیں کر سکتی ـــــ لیکن وہ ہیں کہ بس اس رنگ کے سوا کوئی رنگ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اسماء: اس کا حل سوچنا چاہیئے۔ لڑائی تو اس کا حل نہیں۔
ساحرہ: تم ہی کچھ بتاؤ ــــ میرا تو دماغ پھٹ جائے گا۔
اسماء: ہوں.....

(سانولی چائے لے کر آجاتی ہے۔ ٹرالی پر رکھی چائے دانی پر سبز رنگ کی ٹی کوزی اور سبز پھولوں والی پیالیاں رکھی ہیں ــــ ساحرہ سوچ میں ڈوبی ہے ــــ سانولی ٹرالی سامنے رکھ کر چلی جاتی ہے)

اسماء: میں نے تمھاری الجھن کا ایک حل سوچ لیا۔
ساحرہ: کیا؟۔
اسماء: کان میں بتاؤں گی۔
ساحرہ: (اس کی طرف جھک کر) بتاؤ۔

(اسماء اس کے کان میں کچھ کہتی ہے ــــ ساحرہ کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی باتیں دلچسپ ہیں) ــــ

اسماء: کیوں؟ کیا خیال ہے؟
ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) خیال اچھا ہے۔
اسماء: بس پھر عمل شروع کردو۔ آج ہی سے۔
ساحرہ: لیکن وہ آتو لیں۔ صبح سے غائب ہیں۔
اسماء: آخر تو آئیں گے ہی ــ
ساحرہ: یہ بھی کر دیکھتی ہوں۔ لیکن نتیجہ ــ
اسماء: (بات کاٹ کر) خاطر خواہ نکلے گا۔
ساحرہ: کیا معلوم؟

اسماء: مجھے یقین ہے۔

ساحرہ: خدا کرے ایسا ہی ہو۔

اسماء: ضرور ہو گا ——— اچھا بھئی چائے بناؤ ——— باتیں چائے کے ساتھ بھی ہو سکتی ہیں۔

(ساحرہ مسکراتے ہوئے چائے بنانے لگتی ہے)

(وہی خواب گاہ، ساحرہ نے صبح والی ساڑھی پہن رکھی ہے جو نسیم کراچی سے لایا تھا۔ آرائش و زیبائش بھی خوب کی ہے۔ کانوں میں سبز موتیوں والے آویزے بھی پہن رکھے ہیں۔ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی وہ سبز رنگ کی اون سے سلائیاں بُن رہی ہے۔ نسیم ناراضگی کا انداز لیے کوٹ اتار کر ہینگر میں لٹکا رہا ہے۔ مُنہ پُھلائے روٹھا روٹھا سا نظر آتا ہے ساحرہ ایک ادائے دلربائی سے اسے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ لیکن وہ اس کی جانب دیکھتا تک نہیں۔ ساحرہ سلائیاں میز پر رکھ کر مہین ساڑھی کا پلّو درست کرتے اس کے قریب آتی ہے۔ برقی روشنی میں اس کا حسن بیمثال نظر آتا ہے۔ نسیم منہ دوسری طرف پھیر کر ٹائی کی گرہ کھولتا ہے)

ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) آج اتنی دیر لگا دی آپ نے —— دس بج رہے ہیں۔

(نسیم کوئی جواب نہیں دیتا —— ساحرہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آجاتی ہے۔)

ساحرہ: (نسیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے) کہاں رہے سارا دن ——

نسیم: (خفگی سے) تمہیں کیا ——

ساحرہ: مجھے کیوں نہیں؟ سارا دن انتظار کرتی رہی —— دوپہر کھانے کیلئے

بھی نہ آئے ۔۔۔

نسیم : (روٹھے روٹھے لہجے میں) نہیں آیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ۔

ساحرہ : (آنکھوں کو شوخی سے نچاتے ہوئے اس کی ٹائی پکڑ لیتی ہے) خفا ہیں ابھی تک ۔

نسیم : (جھٹکے سے ٹائی چھڑا کر) خفگی کس بات کی ۔

ساحرہ : اللہ اللہ ۔۔۔۔ ایسا غصہ ۔

نسیم : مجھے کپڑے بدلنے دو ۔

ساحرہ : کھانا نہیں کھائیں گے ۔

نسیم : نہیں !

ساحرہ : کھا آئے ۔

نسیم : مجھے کپڑے تبدیل کرنا ہیں ۔

ساحرہ : میں کھانے کا پوچھ رہی ہوں ۔

نسیم : مجھے نہیں کھانا ۔۔۔۔ کھانا ۔۔۔۔ (غصے سے) اونچا سنتی ہو کیا ۔

ساحرہ : (اس کے کندھے سے سر لگا دیتی ہے) آپ صبح والی بات پر ناراض ہیں نا ۔ ؟

نسیم : نہیں ۔۔۔ (آواز میں غصے کی جھلک ہے) ناراضگی کی کیا بات تھی ۔

ساحرہ : معاف کردیں ۔

نسیم : کوئی بات بھی ہو ۔

ساحرہ : دیکھئے ، غصہ تھوک دیجئے ۔۔۔ میں اپنے رویے پر نادم ہوں ۔

نسیم : (چند لمحے ساکت نظروں سے ساحرہ کو دیکھتا ہے ۔۔۔ ساحرہ مسکرانے لگتی ہے ۔۔۔ نسیم کے چہرے پر اب خفگی کی بجائے افسردگی کے تاثرات ہیں ۔۔۔) ساحرہ ۔۔۔

ساحرہ : (نادم ہو کر) معاف کردیں نا ۔۔۔ آئندہ کبھی اس بات کی نوبت

نہیں آئے گی۔

نسیم: (طنزیہ انداز میں) میں اپنی پسند تم پر ٹھونسنا نہیں چاہتا —— تم انسان ہو پتھر تو نہیں۔

ساحرہ: ہائے اللہ آپ نے تو بات ہی پکڑ لی میری —— جانے کیوں غصہ آگیا تھا اس وقت ——

نسیم: خدا جانے کب سے دبائے بیٹھی تھیں غصہ —— پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں محتاط ہو جاتا۔

ساحرہ: دیکھئے میں معافی مانگ رہی ہوں —— آپ بھی غصہ جانے دیجئے۔

نسیم: (ٹائی ہاتھ میں پکڑ کر افسردگی سے) ساحرہ —— تم نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔

ساحرہ: (پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہے) اب جانے بھی دیجئے نا —— میں خود ہی نادم ہوں۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا نسیم —— آپ کی پسند مجھے محبوب ہوگی۔ اب تو مسکرا دیجئے ——

نسیم: (اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر) کبھی کبھی خدا جانے تمھیں کیا ہو جاتا ہے۔

ساحرہ: (اس کے سینے سے سر لگا کر) اب کبھی کچھ نہیں ہوگا۔

نسیم: (اسے بازوؤں میں لے لیتا ہے) ساحرہ۔

ساحرہ: نسیم۔

(چند لمحے دونوں بے سدھ سے کھڑے رہتے ہیں۔ باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ ساحرہ اور نسیم مسکراتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں۔ سانولی اندر آتی ہے)

سانولی: کھانا لگا دوں بیگم صاحب جی۔

ساحرہ: ہاں۔

سانولی: بہت اچھا (چلی جاتی ہے ۔)

ساحرہ: میری آنتیں تو قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ بڑے وہ ہیں آپ —— خود تو دوپہر بھی کھانا کھالیا ہوگا۔ میں صبح سے بھوکی بیٹھی ہوں۔

نسیم: (مسکراتے ہوئے) خاک کھالیا تھا۔ قسم لے لو جو ایک کھیل بھی مُنہ میں گئی ہو —— میری آنتیں تمھیں دعائیں دے رہی ہیں۔ بے ایمان کہیں کی۔ سارا دن برباد کردیا میرا۔ اتنا پریشان کیا۔

ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) خود کیا کم پریشان رہی ہوں ——

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے لگتے ہیں)

(وہی خواب گاہ ــــ دوپہر کا وقت ہے۔ نسیم دفتر سے آتا ہے۔ بیگ ایک میز پر رکھ کر الماری میں اپنے گھر کے کپڑے دیکھتا ہے، لیکن الٹ پلٹ کرنے کے باوجود کپڑے نہیں ملتے ــــ الماری کا پٹ کھلا چھوڑ کر وہ کھڑکی کے قریب آ کر ساحرہ کو آواز دیتا ہے)

نسیم : ساحرہ ــ

ساحرہ کی آواز آتی ہے : جی ۔

نسیم : بھئی! میرے کپڑے کہاں ہیں ۔

آواز : جی! الماری ہی میں ہیں ۔

نسیم : مجھے نہیں مل رہے ــ

آواز : ابھی آئی ۔

(نسیم ادھر ادھر ٹہلنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد ساحرہ اندر آتی ہے ــ سبز رنگ کا لباس پہنے ہے۔ چہرے پر جان وارسی بشاشت ہے۔ آنکھوں میں شوخ سی چمک ہے۔)

نسیم : میرے کپڑے کہاں ہیں ۔!

ساحرہ : الماری میں ۔

نسیم : میں تو دو تین بار دیکھ چکا ملے ہی نہیں ۔

ساحرہ: کون سے کپڑے تلاش کر رہے ہیں۔

نسیم: بھئی گھر پہننے کے ۔۔ شلوار قمیض ۔۔

ساحرہ: الماری ہی میں تو ٹنگے ہیں۔

نسیم: نکال دو تم ہی ۔۔۔ (نسیم بوٹوں کے تسمے کھولنے لگتا ہے۔ ساحرہ الماری کی طرف جاتی ہے۔کھونٹی سے شلوار قمیض اتارتی ہے۔اور نسیم کی طرف بڑھا دیتی ہے ۔۔)

نسیم: گہرے سبز رنگ کی شلوار اور قمیض کو متعجب ہو کر دیکھتا ہے) میں اپنے کپڑے مانگ رہا ہوں۔

ساحرہ: (مسرور سی سنجیدگی سے) آپ ہی کے تو ہیں۔

نسیم: یہ میرے کپڑے ہیں۔

ساحرہ: (قمیض پھیلا کر دکھاتی ہے) آپ کی ہی تو ہے قمیض یہ شلوار بھی۔

نسیم: (حیران ہو کر) لیکن یہ سبز رنگ کے ۔۔۔

ساحرہ: (اترا کر پیار سے) کتنا پیارا رنگ ہے۔آپ پہنیں گے تو یوں لگے گا۔ جیسے سبز سبز پتّوں میں گلاب کا پھول کھلا ہے۔

نسیم: (اچنبھے سے) ساحرہ۔ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔

ساحرہ: کیوں؟ دیکھئے نا پھول مذکر ہوتا ہے۔ گلاب کا پھول دراصل مرد سے مماثلت رکھتا ہے۔آپ سبز کپڑے پہنیں گلاب کا پھول ۔۔۔

نسیم: (جھلّا کر) یہ کیا حماقت ہے۔

ساحرہ: کیوں جی؟

نسیم: میں اور یہ کپڑے۔

ساحرہ: ہرج کیا ہے۔

نسیم: ساحرہ۔

ساحرہ: دیکھئے، آپ حیل وحجت نہ کریں۔میں نے آپ کی پسند کو دل وجان

سے اپنا لیا ہے۔ اب مجھے اس سبز رنگ سے بالکل ویسے ہی محبت ہے جیسے آپ سے۔
اب آپ کو یہ کپڑے پہننا ہی پڑیں گے۔

نسیم: (غصیلے لہجے میں) ساحرہ۔۔۔

ساحرہ: (اطمینان سے) جی!۔۔۔

نسیم: دوسرے کپڑے نکالو۔۔۔ یہ کیا مذاق ہے۔

ساحرہ: یہ مذاق نہیں نسیم۔۔۔

نسیم: (جھلا کر) خدایا۔

(ساحرہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔)

نسیم: میں یہ کپڑے نہیں پہنوں گا۔۔۔ نہیں پہن سکتا۔ دوسرے نکالو۔

ساحرہ: (ادائے ناز سے) آپ ضرور پہنیں گے۔۔۔ دوسرے کپڑے اب نہیں ملیں گے۔ پہن کر دیکھئے تو سہی۔ (نسیم جھلا جاتا ہے۔ ساحرہ محبت سے اسے دیکھنے لگتی ہے۔)

ساحرہ: میں سال بھر سے آپ کی پسند کے کپڑے پہن رہی ہوں۔ اس رنگ سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن کل کی لڑائی سے میں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ اس رنگ کو دل و جان سے قبول کروں۔ آپ کی پسند میری پسند ہے اب۔

نسیم: کیا فضول باتیں کر رہی ہو (جھلا کر) یہ رنگ مردوں کے پہننے کا ہے؟

ساحرہ: کوئی رنگ بھی کسی کے لئے مخصوص نہیں ہوتا۔۔۔ پسند کی بات ہے بس۔۔۔ میرا دل نہ توڑیئے۔ پہن لیجئے نا۔۔۔ آپ تو اتنے اچھے ہیں۔۔۔ (نسیم کے گلے میں باہیں ڈال کر لہرا جاتی ہے)

نسیم: (کشمکش و پیچ میں) حد ہو گئی۔

ساحرہ: نسیم۔۔۔ پہن لو نا۔۔۔ دیکھو تو کتنا کھلتا ہوا رنگ ہے۔

(نسیم کپڑے اٹھا کر سر ہلاتے ہوئے پریشان پریشان سا ساتھ والے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ساحرہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ابل پڑنے والی ہنسی کو روک لیتی ہے۔)

(نسیم نے سبز شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔ ہاتھ میں سبز ہی رنگ کا تولیہ ہے۔ غسل خانے سے وہ اپنے گیلے بالوں کو پونچھتا باہر آتا ہے۔ ساحرہ الماری سے اس کے کپڑے نکال رہی ہے۔ سبز بنیان اور بوسکی کی سبز قمیض کرسی کی پشت پر ڈال دیتی ہے۔)

نسیم: (بنیان اور قمیض دیکھ کر پریشان ہوجاتا ہے) یہ — یہ کیا۔

ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) یہ آپ کی بنیان — یہ قمیض۔

نسیم: (جھلّا کر غراتا ہے) یہ — سبز بنیان — سبز قمیض — تمہیں کیا ہوگیا ہے — دماغ تو نہیں چل گیا۔

ساحرہ: (خوبصورتی سے ہنس کر) بالکل نہیں — صرف آپ کی پسند اپنائی ہے — سبز رنگ سے آپ کو والہانہ لگاؤ تھا۔ مجھے اب اس رنگ سے مجنونانہ عشق ہوگیا ہے۔

نسیم: (کچھ سمجھ نہیں پاتا۔ کہ کیا کہے۔) ساحرہ!

ساحرہ: (مسحور کن انداز میں اسے دیکھتی ہے۔ کتنا خوب صورت رنگ ہے۔ دیکھئے — قمیض اسے دکھاتی ہے۔)

نسیم: بخدا مذاق ختم کرو۔ یہ سبز کپڑے پہنا کر پہلے ہی کارٹون بنا رکھا ہے۔ مجھے — اب یہ سبز قمیض پہن کر دفتر جاؤں گا؟

ساحرہ: کیا ہرج ہے۔ پسند کا کوئی مول نہیں ہوتا۔
نسیم: (چڑ جاتا ہے) جہنم میں گئی ایسی پسند۔
ساحرہ: (کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے) یہ آپ کہہ رہے ہیں۔
نسیم: تمہیں یہ سوجھی کیا ہے؟
ساحرہ: (سنجیدہ نظر آتی ہے) کیوں؟
نسیم: مجھے تو لگتا ہے۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔
ساحرہ: واہ جی۔
نسیم: تو اور کیا۔
ساحرہ: میں نہیں چاہتی۔ کہ معمولی سی بات کے لئے ہماری ازدواجی زندگی تلخ ہو جائے — اسی لیے میں نے اپنے آپ کو ذہنی اور دماغی طور سے اس رنگ سے وابستہ کر لیا ہے —
نسیم: لیکن — لیکن تم — زبردستی مجھے اس رنگ کے پہننے پر مجبور کیوں کرتی ہو۔
ساحرہ: میاں بیوی میں زبردستی اور مجبوری کا تکلف کیسا۔ مجھے آپ کی پسند عزیز ہے۔
نسیم: لیکن اس سے میرے کپڑوں کا کیا تعلق؟
ساحرہ: تعلق کیوں نہیں۔ جب گھر کی ہر چیز سبز ہو سکتی ہے۔ گاڑی کا رنگ سبز ہو سکتا ہے۔ میرا ہر لباس سبز ہو سکتا ہے۔ تو آپ کے کپڑے سبز کیوں نہ ہوں۔ ہر چیز سبز ہے آپ کے رنگ برنگے کپڑے بڑے عجیب سے لگتے ہیں۔
نسیم: (کرسی پر بیٹھ کر سر پکڑ لیتا ہے) اوہ — تم — بس بھی کرو اب مذاق ختم ہو گیا۔ میری سفید قمیض نکالو۔ (تولیہ دوسری کرسی پر پھینک دیتا ہے)
ساحرہ: سفید قمیض نہیں ہے۔
نسیم: (غصے میں آجاتا ہے) مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔ دس دن پہلے

ہی بار رہا ہوں۔ سارا کاروبار چوپٹ ہو رہا ہے ۔۔۔

ساحرہ: میں کب روکتی ہوں ۔۔۔ تیار ہو کر چل دیں۔

نسیم: کہاں رکھی ہیں میری سفید قمیضیں ۔۔۔؟

ساحرہ: رنگساز کے پاس۔

نسیم: (چیخ کر) کیا؟

ساحرہ: میں نے سب قمیضیں رنگنے کو دے دیں ۔۔۔

نسیم: (چلاتا ہے) ساحرہ ۔۔۔

ساحرہ: کیوں جی ۔۔۔ برافروختہ کیوں ہو رہے ہیں ۔۔۔ میں نے تو آپ کی پسند کا احترام کرتے ہوئے آپ کی پسند ۔۔۔

نسیم: (اٹھ کر جھلاتے ہوئے لہجے میں) جہنم میں گئی پسند ۔۔۔ کیوں برباد کروا دیئے میرے کپڑے۔

ساحرہ: برباد کہاں کروائے ہیں، سبز رنگ کے رنگوائے ہیں۔

نسیم: (چیختے ہوئے) ساحرہ ۔۔۔

ساحرہ: (اطمینان سے) حیرانگی کی بات ہے۔ سبز رنگ نہ ہُوا ہوّا ہو گیا۔ آخر میں بھی تو صبح شام پہنتی ہوں ۔۔۔ آپ پہن لیں گے تو۔

نسیم: (ساحرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی شوخی اور چہرے کی مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ جاتا ہے ۔۔۔) کافی ذہین ہو۔

ساحرہ: (حیران ہو کر) جی؟

نسیم: سبز رنگ سے گلو خلاصی کروانے کا اچھا طریق نکالا۔

(ساحرہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے)

نسیم: (چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے معافی مانگنے کے انداز میں کھڑا ہو کر) معافی دے دو بیگم صاحبہ ۔۔۔ آئندہ جس رنگ کا جی چاہے کپڑا پہنو ۔۔۔ بخدا مجھ پر رحم کرو۔ میں ایسی پسند سے باز آیا ۔۔۔

ساحرہ: (اک مسحور کن ادا سے اسے دیکھتے ہوئے) واقعی؟

نسیم: (کانوں کو ہاتھ لگاکر) توبہ میری جو اب تم سے فرمائش کروں۔

ساحرہ: (قہقہہ لگاتی ہے) ایک دو کپڑے سبز دیکھے تو جناب تنگ آ گئے میری ہمت بھی تو دیکھئے ــــ

نسیم: بس بابا ــــ کہا نا معافی دے دو ــــ چلو لگالو میری سپید قمیض۔

ساحرہ: (ہنستے ہوئے) سب رنگ کے پاس ہیں۔

نسیم: (پیار سے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے) جھوٹ بول رہی ہو نا۔ ایک قمیض برباد کروادی۔ ساری قمیضوں کا یہ حشر کیا تو یاد رکھنا۔

ساحرہ: اوئی اللہ!

نسیم: بتاؤ کہاں ہیں قمیضیں (کلائی اور زور سے مروڑتا ہے ــــ)

ساحرہ: (دوہری ہوتے ہوئے چیختی ہے) بکس میں پڑی ہیں۔ صرف ایک ہی رنگوائی تھی ــــ اوئی ــــ ہائے ــــ میری کلائی ــــ

نسیم: (اور زور سے مروڑتے ہوئے) بے ایمان کہیں کی ــــ برباد کر ڈالی میری قمیض۔

(ساحرہ زور زور سے چیخنے لگتی ہے۔ نسیم ہنستے ہنستے اسے بیڈ پر دھکا دے کر گرا دیتا ہے ــــ)

اُف یہ مرد

(سمیعہ تہذیب نو کا مرقع معلوم ہو رہی ہے۔ لباس میں عریانی ہے۔ چہرے پر میک اپ کی تہیں ہیں۔ بال تراشیدہ ہیں۔ انداز ساختہ اور ادائیں بے باک ہیں۔ وہ اس وقت غصے میں نظر آ رہی ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتی ہے۔ کبھی ٹہلنے لگتی ہے۔ کبھی بنچ پر بیٹھ جاتی ہے ــــ باغ کے ایک تنہا گوشے میں وہ شاہد کا انتظار کر رہی ہے ــــ

سمیعہ: (اپنے آپ سے) شادی کر کے مجھے بھول ہی گیا شاید ــــ آج بھی نہ آیا تو یاد رکھے گا ــــ میرا نام بھی سمیعہ ہے ــــ سارے وعدے بھلا دیئے اس نے ــــ ایک بات بھی تو یاد نہیں رکھی۔ میں اس سے نپٹ لوں گی۔ آ تو ے ــــ (سمیعہ بڑبڑاتی ہے۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ مڑ کر دیکھتی ہے۔ شاہد آ رہا ہے۔ شاہد خوبصورت نوجوان ہے۔ لباس سے شائستہ اور پُروقار نظر آتا ہے)

سمیعہ: (جھپٹنے کے انداز میں اس کی طرف بڑھتی ہے) تم ــــ آ ہی گئے آخر۔ میں تو نا امید ہو چلی تھی۔ کہ آج بھی صرف انتظار کی زحمت دو گے۔ میرا پیغام مل گیا تھا نا۔

شاہد: جی ہاں۔

سمیعہ: پھر اتنی دیر کیوں لگادی ــــ آدھ گھنٹہ ہو گیا مجھے یہاں آئے۔

شاہد: آئندہ تمھیں زحمت اٹھانا نہ پڑے گی۔

سمیعہ: (اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر ہراساں نظر آتی ہے) بڑے سنجیدہ نظر آرہے ہو۔

شاہد: مجھے سنجیدہ نظر آنا ہی چاہیئے۔

سمیعہ: کیوں؟

شاہد: میں اب ایک ذمہ دار شوہر ہوں سمیعہ ــــ مجھ پر میری بیوی کا پورا حق ہے۔

سمیعہ: شاہد!

شاہد: میں آج صرف یہی کہنے آیا ہوں۔ کہ آئندہ میرے اور تمھارے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔

سمیعہ: بیوی کا بھوت اعصاب پر سوار ہو گیا۔

شاہد: بیوی کا بھوت نہیں۔ میرے فرائض میری راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

سمیعہ: تم نے عمر بھر ساتھ نباہنے کی قسمیں کھائی تھیں شاہد۔

شاہد: تم نے شادی سے انکار کر کے ان قسموں کی اہمیت گنوادی۔

سمیعہ: شادی کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی حامی نہیں ہوں۔

شاہد: مجھے والدین کا حکم بجالانا پڑا ــــ

سمیعہ: میں جانتی ہوں۔ تمھاری شادی ہو چکی ہے۔ لیکن شادی اور چیز ہے محبت اور ــــ اس شادی کو ہمارے تعلقات میں رخنہ نہیں بننا چاہیئے۔

شاہد: یہی تمھاری غلطی ہے سمیعہ ــــ میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ ماضی میں جو ہو چکا ہو چکا ــــ اب میں اک شائستہ، شریف اور محبت کرنے والی پیاری سی بیوی کا شوہر ہوں۔

سمیعہ: (سیخ پا ہو کر) اوہو ــــ اتنے مرعوب ہو گئے بیوی سے۔

شاہد: ہونا بھی چاہیئے ــــــ میری بیوی نے مجھے ایسا پُر سکون اور اطمینان بخش ماحول دیا ہے ۔ کہ اب تم سے ملنے کا خیال بھی اس سے جرم کے مترادف معلوم ہوتا ہے ۔ میں اپنی پُر خلوص بیوی سے بددیانتی نہیں کر سکتا ۔

سمیعہ: (غصے سے پیر پٹختی ہے اور شیرنی کی طرح غرّاتی ہے) یہ تم کہہ رہے ہو شاید ــــ تمھاری شادی میں نے صرف اس شرط پر ہونے دی تھی ۔ کہ میں اور تم دونوں حسبِ معمول ایک دوسرے کے قریب رہیں گے ۔ تم نے وعدہ کیا تھا ۔

شاہد: یہ میری ناتجربہ کاری تھی ۔

سمیعہ: اب ؟ اب ؟

شاہد: یہ ہماری آخری ملاقات ہے ۔

سمیعہ: شاہد !!

شاہد: سمیعہ ــــ میرے حالات اسی بات کے متقاضی ہیں ــــ

سمیعہ: تم مجھے یوں چھوڑ دو گے ۔

شاہد: تمھارے دوستوں ــــ ؟

سمیعہ: میں اوروں کی نہیں تمھاری بات کر رہی ہوں ۔

شاہد: میں کہہ چکا نا ــــ اپنی بیوی کو دھوکے میں رکھ کر میں بددیانتی کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا ۔

سمیعہ: بیوی کا اتنا خیال ہے ؟

شاہد: ہونا ہی چاہیئے ۔

سمیعہ: تم نے مجھے وعدوں کے سہارے دیئے تھے ۔

شاہد: میں نادم ہوں ۔

سمیعہ: صرف نادم ہونے سے اپنا پیچھا چھڑا لوگے ــــ ؟ میں تمھیں چین لینے نہیں دوں گی ؟ سمجھے مجھے چھوڑ کر تم سُکھ کی بانسری بجاؤ ۔ یہ ممکن نہیں ہے ۔

شاہد: تم چاہتی کیا ہو ؟

سمیعہ: وہی جو شروع سے چاہتی آئی ہوں۔

شاہد: (غصے سے) یہ اب ناممکن ہے۔ میں اپنی پُرسکون ازدواجی زندگی کو برباد نہیں کر سکتا۔

سمیعہ: (غصے سے پھنکارتے ہوئے) یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے۔

شاہد: (مستحکم آواز میں) بالکل۔

سمیعہ: تو پھر میرا بھی آخری فیصلہ سن لو۔

شاہد: میں تیار ہوں۔

سمیعہ: (اس کی پُرسکون آواز سے چڑ کر) میں تمھیں سکھ کا سانس نہیں لینے دونگی۔

شاہد: (ہنس دیتا ہے) سمیعہ اتنے جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے حلیمی سے تمھیں اپنی مجبوری بتا دی ہے۔ میرا تمھارا ساتھ اب ممکن نہیں تمھارے لیے نئی نئی راہیں کھلی ہیں۔ تمھارے بے تکلف دوست موجود ہیں۔ پھر میری راہ میں حائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

سمیعہ: تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے — تم نے شادی کے بعد بھی مجھ سے تعلقات قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا؟

شاہد: یہ میری غلطی تھی۔ میں اس کے لیے نادم ہوں — شاید اتنی اچھی بیوی نہ ملتی — تو میں سیدھی راہ سے بھٹک کر پھر تمھارے قدموں میں آگرتا لیکن اب — اب نگہت جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے راہِ مستقیم سے بھٹکنا ممکن نہیں — ماضی گزر گیا — اسے میں بھی بھلا دینا چاہتا ہوں تم بھی بھلا دو — مجھے ایک چھوٹی سی جنت میسر آگئی ہے — مجھے —

سمیعہ: (بات کاٹ کر غصے سے) میں تمھاری اس جنت میں آگ لگا دوں گی —

شاہد: (گھبرا کر) سمیعہ۔

سمیعہ: (قدم اٹھا کر چل دیتی ہے۔ جاتے جاتے دھمکی کے انداز میں) تم جس زندگی پر اتنا اترا رہے ہو میں اس میں تلخیوں کا زہر گھول دوں گی — میں تمھاری

بیوی کو سب کچھ بتا کر اسے تم سے اس طرح بدظن کر دوں گی۔ کہ تم پارسائی کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود ننگے نظر آؤ گے ـــــ تم بھول رہے ہو۔ عورت جب انتقام کی آگ بن جائے ـــــ تو سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے ـــ

(تیز آواز میں) سمیعہ۔

(چل دیتی ہے) ہونھ ـــ

(شاہد لپک کر اس تک پہنچنا چاہتا ہے ـــــ لیکن وہ آگ برساتی پھنکارتی، پیر پٹختی وہاں سے چلی جاتی ہے)

(سلیقے اور نفاست سے آراستہ ڈرائنگ روم۔ شاہد مضطربانہ ٹہل رہا ہے۔ کبھی رک کر کچھ سوچنے لگتا ہے۔ کبھی دیوار کے ساتھ لگی خوبصورت پینٹنگ کو دیکھنے لگتا ہے۔ کبھی صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی عالم اضطراب میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے —)

شاہد: (اپنے آپ سے) سمیعہ جیسی لڑکی سے یہ بات بعید بھی تو نہیں — لیکن — لیکن مجھے — کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے — نگہت کو اس نے بدظن کر دیا — تو کیا ہوگا — (سر تھام کر) اُف — کتنی پُر سکون دنیا ہے میری — سب تہہ و بالا ہو جائے گی۔ میری یہ چھوٹی سی جنت آگ سے راکھ بن جائے گی — نہیں — نہیں — ایسا نہیں ہونا چاہیئے — نگہت کا ذہن مسموم نہیں ہونا چاہیئے — میں بے راہ رو تھا — سمیعہ سے میں نے تعلقات بڑھائے تھے — اخلاقی حد بندیوں سے بھی تجاوز کیا تھا۔ لیکن اب تو میں تائب ہوں — مجھے نگہت کے سوا کسی کی ضرورت نہیں — سمیعہ لیکن سمیعہ — جیسی لڑکی — اُف — اس نے انتقام لیا — تو۔ (سر جھٹک کر سوچنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد سر اٹھاتا ہے) کیوں نہ میں سب کچھ خود ہی نگہت سے کہہ دوں — اپنی لغزشوں کا اظہار خود ہی کیوں نہ کر دوں۔ یہ کانٹے خود ہی کیوں نہ نکال دوں — جو ہماری پُر بہار ازدواجی

زندگی کے سینے میں چبھ کر لہولہان کردیں گے۔ نگہت کو یقیناً دھچکا لگے گا۔
لیکن وہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ مزاج میں انکسار ہے — حلیم الطبع ہے۔
صلح جُو ہے۔ وہ یقیناً مجھے معاف کردے گی — ہاں سمیعہ کے آگ لگانے
سے پہلے ہی مجھے نگہت کو ہر بات بتا دینی چاہیئے — یہ ٹھیک ہے۔
یہ ٹھیک ہے — میں اسے آگاہ کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرلوں گا —
میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ، کوئی راز — کوئی بھید نہیں رہنا
چاہیئے — یہی شرافت کا تقاضا ہے — محبت کا اصول ہے —

(کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے وہ اپنا آخری فیصلہ باربار
دُہراتا ہے)

—————— ... ——————

(وہی ڈرائنگ روم ـــــ شاہد صوفے پر بیٹھا ہے۔ اس کے پہلو میں نگہت بیٹھی ہے۔ نگہت شاہد کا سویٹر بُن رہی ہے۔ شاہد بار بار اس کی طرف دیکھتا ہے۔ لب کھولنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر جیسے ہمت جواب دے جاتی ہے ـــــ وہ پریشان سا ہو جاتا ہے۔ نگہت اس کی حالت سے بے خبر نہیں ـــــ)

نگہت: (مسکرا کر) کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔

شاہد: اوہ ـــ نہیں تو ـــ بات ـــ دراصل یہ ہے ـــ کہ

نگہت: کہیئے نا چپ کیوں ہو گئے۔

شاہد: (حالت قابلِ رحم ہے) نگہت ـــ

نگہت: جی۔

شاہد: کچھ نہیں ـــــ میرا مطلب ہے ـــ

نگہت: ہائے اللہ آپ نے تو پریشان کر دیا ـــــ کیا بات ہے۔ بتا دیجئے نا ـــ

شاہد: (نگہت کا ہاتھ تھام کر) تم ـــ بہت اچھی ہو نگہت ـــــ تم نے میری زندگی کو فردوسی رعنائیاں بخش دی ہیں ـــ کتنا پرسکون اور اطمینان بخش ماحول ہے میرے گھر کا ـــ

نگہت: (مسکرا کر) تمہید بہت لمبی ہو گئی ہے صاحب۔

شاہد: میں سچ کہہ رہا ہوں نگہت ـــــ میرا شادی کا تصور اتنا حسین نہیں تھا۔
نگہت: شکریہ۔
شاہد: تم بہت اچھی ہو نگہت۔
نگہت: آج بار بار اس اعتراف کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے ـــ
(شاہد کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے)
شاہد: ہماری ازدواجی زندگی کتنی خوش گوار ہے۔
نگہت: (حیران ہو کر اس کا منہ دیکھتے ہوئے) جی۔
شاہد: (میں چاہتا ہوں۔ یہ ہمیشہ اسی طرح خوش گوار رہے۔ (اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔)
نگہت: انشاء اللہ اسی طرح رہے گی ـــ
شاہد: (سر نفی میں ہلا کر گھبرائے انداز میں) نگہت ـــ
نگہت: آپ کو کیا ہو رہا ہے۔
شاہد: میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔
نگہت: (حیرت زدہ) کہیے۔
شاہد: نگہت ـــــ شادی کے بعد ہم دونوں ایک ہو گئے ہیں۔
نگہت: (سر جھکائے ہوئے) یقیناً۔
شاہد: ہم دونوں میں کوئی راز ـــ کوئی پردہ نہیں ہونا چاہیے۔
نگہت: (چہرے پر گھبراہٹ) جی ـــ بالکل ـــ بالکل ـــ
شاہد: میں اپنی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا ـــــ نگہت میرے ضمیر پر جو بار ہے وہ اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔
نگہت: (ششدر سی اسے دیکھنے لگتی ہے) آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔
شاہد: اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ معاف کر سکو گی۔
نگہت: جی!

شاہد: شادی سے پہلے میں ایک لڑکی کے دامِ فریب میں الجھ گیا تھا۔

نگہت: (ہاتھ سے سلائیاں گر جاتی ہیں) جی!

شاہد: میں اعترافِ گناہ کر کے تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ کسی وقت تمہیں میرے ماضی کے اس واقعے کا علم ہو کر ذہنی دھچکا لگے۔ اور تم مجھے بد دیانت اور بے ایمان سمجھنے لگو — میں نے یہی سوچا کہ اپنی معصوم اور پُر خلوص نگہت کو سب کچھ بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ میں اب اس لڑکی سے کنارہ کش ہو چکا ہوں۔

(نگہت سر شاہد کے کندھے سے لگا دیتی ہے — شاہد اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کو سر جھکاتا ہے۔)

شاہد: میں جانتا تھا۔ میرے اعتراف سے تمہیں صدمہ پہنچے گا۔ لیکن میں تمہیں اندھیرے میں رکھ کر بدگمانیوں کا شکار بھی نہیں ہونے دینا چاہتا۔ یہ لڑکی فیشن زدہ اور نئی تہذیب کی دلدادہ تھی۔ میرے عہدے اور روپے پیسے سے فائدہ اٹھانے کے سوا اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔ کہ تم جیسی بیوی مل گئی — اور میں فریب کا سنہری طلسم ٹوٹتا دیکھ سکا۔

نگہت: شاہد —!

شاہد: تم مجھے محبوب ہو — اتنی کہ دنیا میں تم سے زیادہ مجھے کوئی شے عزیز نہیں۔ اسی لیے میں نے تمہیں سب کچھ نیک نیتی اور خلوص سے بتا دیا ہے۔ میری لغزش کو معاف کر دو — میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دو نگہت۔

نگہت: (بے اختیار ہو کر) آپ کتنے اچھے ہیں۔ شاہد — آپ کتنے اچھے ہیں۔

شاہد: (اسے بازوؤں میں لے کر) نگہت — تم نے میری لغزش بخش دی!

نگہت: آپ بہت اچھے ہیں شاہد — آپ نے اپنے ماضی کو میرے سامنے بکھیر کر میرے اعتماد کو جیت لیا ہے — آپ چاہتے تو یہ بات چھپا بھی سکتے تھے۔

شاہد: یہی بات تو مجھے گوارا نہ تھی ـــــ میرے اور تمھارے درمیان کسی بات کا پردہ نہیں ہونا چاہیئے ـــــ کیوں ٹھیک ہے نا؟

نگہت: (سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے) آپ سچ کہتے ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں ہونا چاہیئے۔

شاہد: (نگہت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر) آج میں کتنا خوش ہوں نگہت ـــــ تم نہیں جان سکتیں۔

(نگہت سوچ میں ڈوب جاتی ہے)

شاہد: (کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے) تمہیں صدمہ پہنچا ہے نگہت۔

نگہت: (چونک کر) جی ـــــ نہیں ـــــ!

شاہد: (گھبرا کر) چپ کیوں ہو گئی ہو۔ میرے بے باک اعتراف سے یقیناً تمہیں دھچکا لگا ہے۔ لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کوئی اور تمہیں اگر بتاتا۔ تو تمھاری حالت غیر ہو جاتی اور میری پوزیشن تمھاری نظروں میں گر جاتی ـــ لیکن اب تو تمہیں ـــــ فراخدلی سے کام لینا چاہیئے۔ میری کوتاہی کو نظرانداز کرنا چاہیئے۔

نگہت: (بے اختیار ہو کر) آپ بہت اچھے ہیں شاہد ـــــ آپ بہت اچھے ہیں آپ نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا ـــــ آپ عظیم ہیں ـــــ (اس کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے)

شاہد: میری اچھی نگہت (اسے بازوؤں میں لے لیتا ہے۔)

(وہی ڈرائنگ روم۔ نگہت بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔ اس کے چہرے پر تفکر کے آثار ہیں۔ سوچ میں ڈوب جاتی ہے۔ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے)

نگہت: شاہد کتنے عظیم ہیں ـــ انہوں نے اپنی محبت کا قصہ سنا کر اپنا ضمیر صاف کر لیا۔ واقعی ازدواجی زندگی کو ایسے راز ڈس جاتے ہیں ـــ میاں بیوی میں کوئی راز نہیں ہونا چاہیئے ـــ تو ـــ تو کیا ـــ مجھے بھی جمیل کے متعلق شاہد کو سب کچھ بتا دینا چاہیئے ـــ ہاں ضرور ـــ میرے ضمیر پر بھی تو بلا کا بوجھ ہے ـــ جمیل سے میرے تعلقات بے شک ویسے نہ تھے۔ جیسے شاہد کے سمیعہ سے تھے ـــ پھر بھی ـــ میں نے جمیل سے محبت کی تو تھی ـــ محبت؟ ـــ نہیں یہ محبت نہیں تھی ـــ جوان لڑکے اور لڑکی کی قربت سے پیدا ہونے والے ستائشی جذبات تھے۔ جمیل تبدیل ہو کر چلا گیا۔ اس نے مجھے بھلا دیا ـــ میری منگنی شاہد سے ہو گئی۔ میں جمیل کو بھول گئی ـــ پھر شادی کے بعد تو جمیل ذہن سے ہی نکل گیا ـــ لیکن اب بھی ـــ کبھی کبھی پھانس سی جگر میں چبھتی ہے۔ کبھی شاہد کو کہیں سے جمیل کے بارے میں پتہ چل گیا۔ تو وہ ـــ اُف ـــ میری زندگی جہنم بن جائے گی ـــ نہیں ـــ میری یہ پیاری سی جنت، کتنی دلفریب

ہے۔ اسے اجڑنا نہیں چاہیئے ــــ مجھے بھی شاہد کی طرح ہمت سے کام لے کر سب کچھ کہہ دینا چاہیئے۔ میں نے شاہد کو معاف کر دیا تھا۔ شاہد مجھے معاف کر دیں گے ــــ پھر ــــ پھر ــــ کتنی حسین ہوگی ہماری زندگی ــــ دونوں کے دل آئینے کی طرح صاف ہوں گے ــــ دونوں ایک ہو جائیں گے ــــ نگہت اور شاہد ایک وجود کے دو نام ہوں گے ــــ مجھے ضرور شاہد کو سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔ آخر شاہد نے بھی تو سب کچھ بتا ہی دیا۔ کل انہوں نے سمیعہ کے دامِ فریب میں آنے کا اعتراف کیا۔ اور رات ــــ اس کی ایک ایک بات بتا دی ــــ میں نے بھی تو کس فراخ دل سے سب کچھ سنا ــــ شاہد ــــ بڑے عظیم ہیں۔ ان سے کچھ چھپانا گناہ ہے۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔

(وہ نڈھال ہو کر صوفے پر گر جاتی ہے۔ چند لمحے یونہی گزر جاتے ہیں۔ پھر دائیں دروازے سے شاہد اندر آتا ہے۔ وہ بیحد خوش ہے ایک دلفریب دھن گنگنا رہا ہے ــــ نگہت کو یوں نڈھال دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے ــــ)

شاہد: ــــ نگہت ــــ کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک تو ہے۔

نگہت: جی ــــ ٹھیک ہوں۔

شاہد: کیا سوچ رہی ہو۔ کہیں میری باتوں سے اثر تو نہیں لے لیا۔ بخدا میں نے تو ساری بات تمہیں خلوص اور محبت کی بنا پر بتا کر اپنا ضمیر صاف کیا تھا۔

نگہت: آپ نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا ــــ (سر جھکاتے ہوئے) آپ نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ اب میں ــــ میں بھی سوچتی ہوں ــــ کہ اپنے دل ــــ

شاہد: (چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ آنکھیں پھیل جاتی ہیں اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہتا ہے) تم کیا کہنا چاہتی ہو ــــ

نگہت: (انکساری سے سر جھکاتے ہوئے) شاہد ــــ شادی سے پہلے میں نے

بھی ــــ محبت ــــ

شاہد: (چیخ کر) کیا کہہ رہی ہو نگہت۔

نگہت: (اپنی دھن میں) سوچ رہی ہوں۔ مجھے بھی آپ کو ــــ سب ــــ کچھ ــــ

شاہد: (حالت دگرگوں) نگہت!!

نگہت: (حیران ہو کر شاہد کو دیکھتی ہے) آپ نے کہا تھا نا۔ کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی راز نہیں رہنا چاہیئے۔

شاہد: (سخت غصے میں بھر کر) آخر تم کہنا چاہتی ہو۔

نگہت: (ڈرتے ڈرتے) اپنی شادی سے پہلے ــــ کی محبت ــــ

شاہد: (غصّے سے آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں زور سے چیختا ہے) کیا بکواس ہے ــــ تم ــــ تم ــــ شادی سے پہلے محبت کر چکی ہو ــــ! یہ میں کیا سن رہا ہوں ــــ

نگہت: (ہراساں ہو کر اسے دیکھتی ہے)۔ آپ ــــ

شاہد: (سخت غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے) میں ایسی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا۔ میری بیوی اک آوارہ ــــ

نگہت: (چیخ کر) شاہد ــــ

شاہد: (غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ نگہت اسے دیکھتی رہتی ہے وہ خونخوار نظروں سے نگہت کو دیکھتا ہے ــــ پھر میز پر مکہ مارتے ہوئے) یہ ــــ سب کچھ تم نے اب تک کیوں چھپائے رکھا ــــ میں ــــ تمہاری صورت نہیں ــــ دیکھنا چاہتا ــــ

نگہت: (معاملے کی نزاکت کو فوراً سمجھ جاتی ہے۔ چہرے پر مصنوعی بشاشت لاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے) توبہ ــــ توبہ ــــ!

شاہد: (گھور کر اسے دیکھتے ہوئے) تم ہنس رہی ہو۔

نگہت: (اطمینان سے) مقام تو رونے کا ہے ــــ لیکن آپ کی حالت دیکھ کر قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے ــــ حد ہو گئی ــــ میرے مذاق کو اتنا سنجیدہ لے لیا ــــ

شاہد: (حیران ہو کر) مذاق۔

نگہت: اور نہیں تو کیا ہے ـــــ میں تو آپ کا حوصلہ آزمارہی تھی۔

شاہد: (خفت سے) نگہت۔

نگہت: اپنی محبت کا تو قصہ تفصیلاً سناتے رہے ـــــ لیکن جب میں ـــــ

شاہد: (خفت سے) تمھیں ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

نگہت: عورت حقیقت برداشت کرجائے۔ لیکن مرد سے مذاق بھی برداشت نہیں ہو سکتا۔ توبہ ـــــ توبہ (ہنسنے لگتی ہے ـــــ)

شاہد: (اٹھتے ہوئے) تم نے تو میرا آدھا خون پانی کر دیا۔

نگہت: (کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ لیکن آنکھوں سے آنسو چھلک جاتے ہیں۔) باہر سے شاہد کو دوست کے بلانے کی آواز آتی ہے۔ وہ نگہت کے گال پر پیار سے ہاتھ چھوتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ نگہت آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہے۔ اک گہرا ٹھنڈا سانس لے کر کہتی ہے۔

نگہت: اُف یہ مرد۔

(بہتے آنسو ـــــ دوپٹے میں جذب کرلیتی ہے)

ساڑھی

(متوسط طبقے کا ایک کمرہ ـــــ دو پلنگ دیوار کے ساتھ لگے پڑے ہیں ۔ جن پر رنگ دار بیڈ کور پڑے ہیں ۔ کونے میں لمبوترے آئینے والی ڈریسنگ ٹیبل ہے ۔ جس پر بناؤ سنگار کی متعدد چیزیں رکھی ہیں ۔ ایک میز اور دو کرسیاں بھی دیوار کے ساتھ ہیں ۔ کھڑکیوں پر کاٹن کے پردے ہیں ۔ اور دو ایک معمولی سی سینریاں بھی دیواروں پر آویزاں ہیں ۔ پچیس چھبیس سالہ خوش شکل شاہدہ پلنگ پر بیٹھی کپڑوں کو دیکھ رہی ہے ۔ سامنے رکھے صندوق سے وہ کبھی ساڑھی کبھی سوٹ کبھی لہنگا نکال نکال کر دیکھتی ہے ـــــ اور ناپسند کر کے پلنگ پر ڈالے جاتی ہے ـــــ)

شاہدہ : (سبز رنگ کی ہلکے سے بارڈر والی ساڑھی پھیلا کر سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) یہ ـــــ لیکن ـــــ مسلی مسلی سی ہے ۔ رات کا فنکشن اور یہ ساڑھی ـــــ اچھی نہیں رہے گی ـــــ لیکن پھر پہنوں کیا ـــــ لہنگے کا سارا کامدانی کام ماند ماند پڑ چکا ہے ۔ ہونھ ـــــ خاک اچھا لگے گا ۔ ڈھنگ کا کوئی کپڑا بھی تو نہیں ـــــ (ساڑھی پھینک کر پھر پلنگ پر آ بیٹھتی ہے اور کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی ہے) یہ غرارہ ـــــ نہیں ـــــ سارا

کنارہ پاؤں میں روندا ہوا ہے ــــ اس کی کرتی بھی تو تنگ ہو گئی ہے۔ چھ سال ہو گئے شادی کو ــــ (گہری آہ بھر کر متفکرانہ) کب تک چلتے یہ کپڑے ــــ اور پھر ڈیزائن بھی تو بدل جاتے ہیں ــــ اب کون پہنتا ہے ایسے کام والی چیزیں ــــ تو ــــ تو پھر ــــ کیا پہنوں گی آج رات ــــ موئی تنخواہ بھی تو اتنی نہیں۔ کہ کسی مہینے کوئی قیمتی چیز خرید لی جائے ــــ (مایوسی سے کپڑوں کو دیکھتی ہے) ہائے اللہ! کیا کروں ــــ معمولی سی تقریب ہوتی ــــ تو بات بھی تھی۔ سارے شہر کی بیگمات آتی ہوں گی ــــ ایک سے ایک اعلیٰ لباس میں ہو گی ــــ اور اپنا ــــ اپنا ــــ یہ حال ــــ (کچھ سوچ کر چٹکی بجاتی ہے) ٹھیک ــــ ٹھیک ــــ کیا فرق پڑے گا ــــ بس ٹھیک ہے ــــ (جلدی جلدی کپڑے سمیٹنے لگتی ہے۔ نعیم اندر داخل ہوتا ہے ــــ اس کے ہاتھ میں فائل ہے۔ چہرے پر پژمردگی کی دھول ــــ لباس بھی معمولی سا ہے۔ شکل و صورت اچھی ہے۔)

نعیم : اوہ ــــ ہو ــــ یہ کیا نمائش لگا رکھی ہے۔

شاہدہ : (گھوم کر اسے دیکھتی ہے) آپ آ گئے۔

نعیم : جی آ گیا (فائل میز پر رکھ کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بوٹ اتارنے لگتا ہے) یہ کپڑے کیوں نکالے ہیں ؟

شاہدہ : آج رات دعوت پہ جانا ہے۔

نعیم : کہاں ؟

شاہدہ : بیگم نصیرہ حامد کے ہاں۔

نعیم : بیگم نصیرہ حامد کے ہاں !

شاہدہ : (فخر سے) جی ہاں۔

نعیم : وہ ــــ وہ جو ــــ بہت امیر ــــ

شاہدہ: (ہنس کر) جی ہاں —— شہر کی امیر کبیر بیگم ہیں۔ ان کے ہاں آج رت ڈنر ہے ——

نعیم: (تعجب سے) اور تم بھی مدعو ہو۔

شاہدہ: (فخر سے تن کر) جی ——

نعیم: (ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے) تمھاری ان کی کب سے واقفیت ہے۔

شاہدہ: واقفیت ؟ (ہنس کر) دوستی کہیئے۔

نعیم: اوہو —— (اٹھ کر ٹائی کھونٹی پر ڈال دیتا ہے۔) دوستی اور بیگم نصیرہ حامد سے۔

شاہدہ: کیوں جی —— کوئی اعتراض ہے آپ کو۔

نعیم: عجیب سی بات ہے۔

شاہدہ: (مسکراتے ہوئے) کیوں ؟

نعیم: کہاں وہ کہاں تم ——

شاہدہ: یہ کیا منطق ہوئی۔

نعیم: دوستی کے لیے کوئی بنیادی نسبت بھی تو ہونی چاہیئے شاہدہ —— ایسے لوگوں سے ہم لوگ واسطہ نہیں رکھ سکتے۔

شاہدہ: کیوں جی —— ؟ کیا ہم کسی سے کم ہیں۔ باہر اس ٹھاٹھ سے نکلتے ہیں کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ کہ ہماری ماہانہ آمدنی کل چار سو روپے ہے ——

(ہنستی ہے)

نعیم: چار سو کو چار ہزار بنا کر نمائش کرنا عقلمندی نہیں۔

شاہدہ: جانے دیجئے —— دل خوش کرنے کا یہی ایک وسیلہ ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔

نعیم: انسان کو اپنی چادر کے اندر ہی رہنا چاہیئے۔

شاہدہ: (مسکراتے ہوئے) بس اب بحث نہ شروع کر دیجئے گا۔

نعیم: اچھا صاحب! ڈنر کی خوشی میں ہمیں بھوکا رکھا جائے گا کیا ؟

شاہدہ: آپ کپڑے تو بدلیئے —— میں کھانا لاتی ہوں۔

نعیم: (مسکرا کر) تم کھا چکیں؟
شاہدہ: نہیں۔
نعیم: کھاؤ گی بھی نہیں؟
شاہدہ: کیوں؟
نعیم: رات دعوت جو ہے۔ دوپہر کا فاقہ کرو گی —
شاہدہ: (اترا کر) واہ جی آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ ایسی دعوتوں میں تو میں اتنا تکلف برتتی ہوں۔ کہ اکثر بھوکا ہی رہنا پڑتا ہے۔
نعیم: یہ بھی فیشن ہو گا۔
شاہدہ: جی —
نعیم: اچھا بھئی اب سمیٹو ان کپڑوں کو — یہ رات کے لیے لباس کا انتخاب ہو رہا ہو گا۔
شاہدہ: (منہ لٹکا کر) لیکن کپڑا تو کوئی ہے ہی نہیں جو رات پہن سکوں۔
نعیم: (تعجب سے) کیوں؟ یہ ڈھیر کس مرض کی دوا ہے۔
شاہدہ: سب پرانے — مسلے ہوئے — اتنے بڑے اجتماع میں انہیں پہن کر جاؤں۔
نعیم: جانا ایسا کون سا ضروری ہے بیگم۔
شاہدہ: کیوں نہیں! بڑے بڑے لوگوں سے تعارف ہو گا۔ شہر کی چیدہ چیدہ بیگمات مدعو ہیں!
نعیم: تعارف نہ ہو گا تو کیا فرق پڑے گا۔
شاہدہ: ہائے اللہ آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ یہ تعارف بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارا بگڑتا ہی کیا ہے۔ لینا ایک نہ دینا دو — کونسا انہیں اپنے گھر بلانا پڑے گا۔
نعیم: اچھا بھئی تم جانو اور تمہارے کام — کھانا لاؤ بھوک لگی ہے۔

شاہدہ: (اٹھ کر اس کے قریب کھڑی ہو کر) کھانا کھانے کے بعد ایک کام کریں گے۔

نعیم: کیا؟

شاہدہ: وہ — آپ کی رشتہ دار — اسماء ہے نا۔ اسماء سلیم۔

نعیم: ہاں۔ ہاں۔

شاہدہ: اس کے ہاں جائیں گے —

نعیم: کس لیے؟ —

شاہدہ: اس کے پاس بے انتہا، خوبصورت اور قیمتی ساڑھیاں ہیں۔

نعیم: (حیران ہو کر) امیر لوگ ہیں۔ ضرور ہوں گی۔ لیکن تم —

شاہدہ: ایک سے ایک بڑھیا — ایک سے ایک قیمتی — کیا غضب کی ساڑھیاں پہنتی ہے وہ — خاص کر وہ —

نعیم: تم کہنا کیا چاہتی ہو۔

شاہدہ: اس سے ایک ساڑھی مانگ لائیے —

نعیم: ہیں؟ —

شاہدہ: (پیار سے) تو کیا ہوا — ایک ساڑھی ہی ہے نا — دو گھنٹے کی تقریب ہے۔ پہن جاؤں گی — براؤن ساڑھی اس نے خالہ حمیدہ کی بیٹی کی شادی پر پہنی تھی۔ اللہ کیا خوبصورت رنگ تھا۔ اور تلہ ایسا بھڑکدار — پوری محفل میں نمایاں تھی وہ اس ساڑھی سے۔

نعیم: (جھلا کر) شاہدہ — میں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتا — مانگے تانگے کی چیز —

شاہدہ: (مسکرا کر) ہائے اللہ — مانگے تانگے کی چیز کیا ساڑھی کے اوپر لکھا ہو گا یہ — اور کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ ذرا اپنی شان بن جائے گی۔ (منہ بنا کر) میں یہ سب کچھ آپ ہی کی عزت بنانے کے لیے کرتی ہوا)۔ حمیدہ کی بیٹی کی شادی پر اپنی دوست فاخرہ کی چوڑیاں پہنی تھیں۔ رشتہ داروں کی آنکھیں

کھلی کی کھلی رہ گئیں ـــــ ہر ایک نے پوچھا کب بنوائیں ـــــ نعیم بڑا اچھا ہے۔ بیوی کو چوڑیاں بنوادیں۔ میں نے بھی آپ کی وہ وہ تعریفیں کیں۔ وہ وہ تعریفیں کیں۔

نعیم: شکریہ ـــــ شکریہ ـــــ لیکن معاف کرنا ـــــ یں تمھارے لیے ساڑھی مانگنے نہیں جاؤں گا۔

شاہدہ: سائیکل پہ پانچ منٹ کا راستہ ہے۔ آپ کا ہرج بھی کیا ہے۔

نعیم: جی نہیں ـــــ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا ـــــ کہ بیگم صاحبہ کے لیے ساڑھی مانگنے جاؤں ـــــ تاکہ بیگم صاحبہ کی تقریب میں شان بن سکے۔

شاہدہ: نام تو آپ ہی کا ہوگا نا ـــــ

نعیم: تم میرے نام کو رہنے ہی دو۔

شاہدہ: تو میں خود ہی چلی جاؤں۔

نعیم: شرم نہ آئے گی مانگتے ہوئے۔

شاہدہ: شرم کی کیا بات ـــــ کوئی یہ تھوڑا ہی کہوں گی۔ کہ تقریب میں پہننے کے لیے ساڑھی دے دو۔

نعیم: تو اور ـــــ

شاہدہ: کسی اور طریقے سے لاؤں گی ـــــ (ہنس کر) سانپ بھی مرے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ـــــ اپنی عزت کا بھرم تو رکھنا ہی ہوتا ہے نا ـــــ آپ کیا سمجھتے ہیں۔

نعیم: کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں۔ چلو کھانا لگاؤ۔

شاہدہ: چلیئے۔

(دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل جاتے ہیں)

(جدید طرز کا ڈرائنگ روم ـــــ فوم کے خوبصورت صوفے پر اسماء اور شاہدہ بیٹھی ہیں ـــــ سامنے ٹرالی پر کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہیں ـــــ)

اسماء: (پلیٹ شاہدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے) یہ لیں نا شاہدہ بہن۔

شاہدہ: شکریہ ـــــ (اپنی پلیٹ میں مالٹے کی قاشیں رکھ لیتی ہے) سنائیے، کیا حال چال ہے؟

اسماء: اللہ کا شکر ہے ـــــ آپ اپنی کہیئے۔

شاہدہ: سب ٹھیک ـــــ

(اسماء چائے بنانے لگتی ہے۔ شاہدہ ساڑھی کے متعلق کہنے کا سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی ہے)

شاہدہ: میں آج ایک خاص کام سے آئی ہوں اسماء۔

اسماء: (چونک کر) جی! ـــــ جی فرمائیے۔

شاہدہ: (ہنستے ہوئے) نعیم آج رات کراچی جا رہے ہیں۔

اسماء: (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) جی ـــــ اچھا ـــــ کسی کام سے جا رہے ہونگے۔

شاہدہ: سرکاری ڈیوٹی پہ جا رہے ہیں۔ (جھجک کر) ایک ہفتے کے دورے پہ جا رہے ہیں۔ میں نے ـــــ سوچا ـــــ اپنے لیے ایک ساڑھی منگوا لوں۔

اسماء: (کچھ نہیں سمجھتی تھی)۔

شاہدہ: (ہنس کر) جس قسم کی ساڑھی میں منگوانا چاہتی ہوں نا ــــ نعیم کو سمجھانے کے باوجود انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا۔

اسماء: (خواہ مخواہ مسکرا کر) مردوں کو عورتوں کی چیزوں کا کیا پتہ۔

شاہدہ: (نعیم کو تو کچھ بھی پتہ نہیں ــــ دراصل آج تک میری کوئی چیز انہوں نے خریدی ہی نہیں میں خود ہی خریدتی ہوں۔

اسماء: (بے دلی سے مسکرا کر) جی (چائے کی پیالی شاہدہ کی طرف بڑھا دیتی ہے۔)

شاہدہ: شکریہ (چائے کا گھونٹ لے کر قریبی تپائی پر پیالی رکھ دیتی ہے) وہ آپ نے حمیدہ خالہ کی بیٹی پر براؤن ساڑھی پہنی تھی نا ــــ

اسماء: (یاد کرتے ہوئے) کون سی؟

شاہدہ: بنارسی ــــ بڑے سے بارڈر والی ــــ چوکور خانوں میں پھول بنے تھے؟

اسماء: (یاد کرتے ہوئے) آں ــــ ہاں ــــ ہاں ہاں۔ یاد آگئی ــــ دراصل میرے پاس تین چار ساڑھیاں براؤن رنگ کی ہیں۔ اچھا وہ چوکور خانوں والی ساڑھی۔

شاہدہ: (مرعوب ہو کر) جی ہاں ــــ وہ ساڑھی۔

اسماء: بڑی قیمتی ساڑھی ہے وہ ــــ

شاہدہ: میں بھی کچھ ویسی ہی ساڑھی منگوانا چاہتی ہوں۔ آپ جانیں بڑی بڑی تقریبات میں شرکت کرتی ہی رہتی ہوں ــــ اس لیے ــــ اچھی اچھی ساڑھیوں کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔

اسماء: جی ہاں ــــ بجا کہتی ہیں۔

شاہدہ: آپ کی یہ ساڑھی مجھے بہت پسند آئی تھی۔

اسماء: (انکسار سے مسکراتی ہے) مجھے بھی بے حد پسند ہے۔

شاہدہ: اب نعیم کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی۔ انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا۔ سوچا آپ کی

ساڑھی انہیں دکھادوں۔

اسماء: (ایک دم) لیکن ـــــ وہ ساڑھی ـــ تو امی نے انڈیا سے منگوائی تھی۔ ایسی شاہد کراچی سے نہ ملے۔

شاہدہ: (جلدی سے) ویسی نہ ملے ـــــ اسی قسم کی لے آئیں گے۔ وہ ـــــ تو میں جانتی ہوں۔ بڑی قیمتی ساڑھی ہو گی۔

اسماء: اسی سے ملتی جلتی میں نے یہاں ایک دکان پر دیکھی تھی۔ پتہ ہے قیمت کیا بتائی اس نے۔

شاہدہ: جی ـــــ یقیناً بہت ہو گی۔

اسماء: تین ہزار ـــــ اوئی اللہ ـــــ میں تو سن کر حیران رہ گئی۔ اس دن سے میں تو بڑی احتیاط برتنے لگی ہوں ـــــ ساڑھیوں کے معاملہ میں۔

شاہدہ: (قدرے گھبرا کر) بھئی اتنی قیمتی ساڑھی خریدنے کی استطاعت تو ہم میں نہیں ـــــ میں صرف نعیم کو دکھانا چاہتی ہوں۔ انہیں تو بنارسی ساڑھیوں کی الف بے کا بھی پتہ نہیں۔ (ہنستی ہے ـــــ بالکل مصنوعی اور پھیکی ہنسی۔)

اسماء: ہوں ـــــ

شاہدہ: آپ ساڑھی دکھانے کو دے دیں۔ صبح واپس بھجوا دوں گی۔

اسماء: (بے دلی سے) لے جایئے ـــــ لیکن کراچی سے ایسی ساڑھی ملے گی نہیں۔

شاہدہ: (خواہ مخواہ ہنس کر) بھئی ایسی تو منگانے سے رہی۔ اس سے ملتی جلتی ہلکی قسم کی تو لا دیں گے نا؟ صرف انہیں دکھانا ہی ہے ـــــ انہیں اندازہ تو ہو جائے گا نا ـــــ

اسماء: لے جایئے ـــــ

شاہدہ: شکریہ۔

اسماء: آپ جائے تو پیجیے ـــــ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

شاہدہ: جی پی رہی ہوں (چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیتی ہے۔)
(چائے کی پیالی خالی کر کے شاہدہ میز پر رکھ دیتی ہے۔ شاہدہ بھی چائے پیتی ہے)۔

اسماء: اور بناؤں۔

شاہدہ: جی نہیں بس شکریہ۔ (گھڑی دیکھ کر) کافی وقت ہوگیا ہے۔ اب اجازت چاہوں گی۔ (مسکرا کر) ساڑھی۔

اسماء: (اٹھتے ہوئے) میں لاتی ہوں۔

(اسماء کمرے سے نکل جاتی ہے ـــــ شاہدہ رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں فاتح کی سی چمک ہے ـــــ کچھ دیر بعد اسماءؑ سفید لٹھے کے رومال میں احتیاط سے تہہ کی ہوئی ساڑھی لے کر آتی ہے)

اسماء: لیجئے۔

شاہدہ: (خوشی سے) شکریہ۔

اسماء: دیکھ لیجئے ـــــ یہی چاہیئے تھی نا ـــــ

شاہدہ: شاہدہ (رومال کھول کر) جی یہی ـــــ اُف کتنی خوبصورت چیز ہے۔

اسماء: ذرا احتیاط سے رکھیئے گا۔ میں نے صرف ایک دفعہ ہی پہنی ہے۔

شاہدہ: (جھینپ کر) جی بس صرف نعیم کو دکھانا ہی ہے ـــــ صبح آپ کی امانت لوٹا دوں گی۔

اسماء: (اخلاقاً) کوئی بات نہیں۔

شاہدہ: (ساڑھی اٹھا کر کھڑی ہو جاتی ہے) بہت بہت شکریہ ـــــ جانے کے لیے قدم اٹھاتی ہے ـــــ اسماء بھی دروازے تک آتی ہے)

شاہدہ: خدا حافظ۔

اسماء: خدا حافظ۔

(شاہدہ کا وہی کمرہ ــــ بلب روشن ہے۔ شاہدہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسماء کی براؤن ساڑھی پہنے اپنے میک اپ کا آخری جائزہ لے رہی ہے۔ نعیم پلنگ پر نیم دراز ہے ــــ وہ نگاہِ شوق سے شاہدہ کو دیکھ رہا ہے ــــ)

شاہدہ: (مڑ کر نعیم کے سامنے آتی ہے) بس ٹھیک۔

نعیم: (قدرے اٹھتے ہوئے مسکرا کر) واہ۔ وا ــــ قیامت بن گئی ہو۔

شاہدہ: (اترا کر) کیوں جی ہم کسی سے کم ہیں کیا؟

نعیم: (اٹھ کر اس کے قریب آجاتا ہے) سراپا قیامت نظر آ رہی ہو۔ خدا قسم! مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ تم اتنی حسین ہو۔

شاہدہ: (شرما کر) ہٹیے جی ــــ اب بنائیے نہیں۔

نعیم: کون کافر غلط کہہ رہا ہے (اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے)

شاہدہ: ہائے اللہ (مسکرا کر) آپ تو بہکنے لگے (پرے ہٹ جاتی ہے)

نعیم: تمھیں دیکھ کر نشہ آگیا۔

شاہدہ: یہ ساڑھی کا کمال ہے۔

نعیم: واقعی!

شاہدہ: کیا شان ہوگی ہماری ــــ آج رات ــ واہ ــــ وا ــــ ان بیگمات کی سرشت

بڑی نرالی ہوتی ہے نعیم ــــ ہوتے سوتے بھی دوسروں کو اچھی حالت میں
دیکھ کر جل جاتی ہیں ــــ ہونہہ ــــ آج بڑا لطف آئے گا۔

نعیم: (ہنس کر) مردوں کا داخلہ بند ہے وہاں ؟

شاہدہ: کیوں؟ ساتھ جانے کو جی چاہنے لگا ؟

نعیم: بالکل ــــ (شوخ نظروں سے شاہدہ کو دیکھ کر اس کے قریب آنے لگتا ہے)

شاہدہ: (اٹھلا کر دور ہٹ کر) بس بس۔

نعیم: خدا قسم آج تو تم بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آ رہی ہو ــــ یوں لگتا ہے، جیسے
کوئی پری ــــ

شاہدہ: (ہنستے ہوئے) بندہ پرور شاعری چھوڑیئے ــــ اور رکشا لا دیجئے۔

نعیم: ابھی تو کافی وقت ہے (گھڑی دیکھ کر) دس منٹ میں ان کے ہاں پہنچ جاؤگی۔

شاہدہ: رکشا ملتے بھی تو کچھ دیر لگے گی نا ــــ

نعیم: رکشے بہت (ہنس کر) ذرا جلوے تو دیکھ لینے دو۔

شاہدہ: توبہ یا اللہ ــــ (پھر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے) اس کے پیچھے
نعیم بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔

(دونوں آئینے میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں ــــ)

شاہدہ: (مڑ کر) اب رکشا لے بھی آیئے نا ــــ

نعیم: اتنا قیمتی لباس اور جاؤگی رکشے میں۔

شاہدہ: اور کس میں جاؤں۔

نعیم: (مذاقاً) ساڑھی مانگ لائی تھیں۔ موٹر بھی مانگ لیتیں۔

شاہدہ: (کھلکھلا کر ہنستے ہوئے) ساڑھی تو دکھانے کے بہانے لائی تھی۔ کہ ایسی ہی
منگوانا ہے۔ موٹر کا کیا کہتی۔

نعیم: موٹر کا بھی یہی کہہ لیتیں ــــ خریدنا ساڑھی تھی نا موٹر ــــ کام بن جاتا۔

(دونوں ہنس پڑتے ہیں ــــ)

شاہدہ: اچھا جی ــــ اب تشریف لے جایئے۔ مجھے وقت پر پہنچنا ہے رکشا لے بھی آیئے ــــ
نعیم: بہت اچھا حضور (ہنس کر) رکشا تو رکشا اس وقت موٹر کا حکم دیتیں تو کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا۔
شاہدہ: رکشے میں جاتے ہوئے برا تو محسوس ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔
نعیم: سب مہمان موٹروں ہی میں آئیں گے۔
شاہدہ: یقیناً۔
نعیم: اور جناب۔
شاہدہ: میں رکشا ان کی کوٹھی تک تھوڑا ہی لے جاؤں گی۔
نعیم: تو پھر؟
شاہدہ: ذرا پرے ہی اتر جاؤں گی ــــ رکشے پر جا کر بے عزتی کروانا ہے میں نے ــــ پیدل جانا اتنا معیوب نہیں جتنا رکشے پہ ــــ خاص کر اتنی بڑی تقریب میں ــــ (اٹھلا کر) بیگم نعیم احمد کوئی چھوٹی موٹی اسامی نہیں ہے جناب۔
نعیم: اچھا جی۔

(اس کی گال پیار سے تھپکتے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے۔
شاہدہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کی جانب مڑ جاتی ہے ــــ اور اپنے ہونٹوں پر سرخی کی ایک اور تہہ جمانے لگتی ہے ــــ)

ــــ :: ــــ

(بیگم نصیرہ حامد کا شاہانہ ڈرائنگ روم ــــ بڑے بڑے قیمتی صوفے ــــ ارغوانی قالین ــــ ریشمی پردے۔ خوبصورت آرائشی چیزیں۔ ہر چیز سے شانِ امارت ٹپک رہی ہے۔ رنگ برنگے بھڑکیلے ملبوسات ــــ زیوروں کی کھنک ــــ ہنسی مذاق چہچہے قہقہے، غرضیکہ خوب گہما گہمی ہے ــــ بیگم نصیرہ حامد سفید بنارسی ساڑھی میں ملبوس مہمانوں کی احوال پُرسی کر رہی ہے ــــ شاہدہ اک شانِ امتیازی سے بیگم راشد، بیگم واحد اور بیگم سعید کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہے۔ بیگم نصیرہ حامد ان کے پاس آتی ہے)۔

بیگم نصیرہ حامد: ہو ــــ کیا حال ہے ــــ (قریب بیٹھ جاتی ہے)

شاہدہ: شکریہ ــــ شکریہ۔

بیگم نصیرہ حامد: کتنی پیاری لگ رہی ہو ــــ کتنی خوبصورت ساڑھی ہے۔

بیگم راشد: واقعی ــــ بے نظیر چیز ہے۔

بیگم واحد: میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ لاجواب ساڑھی ہے۔

شاہدہ: (فخر سے) شکریہ ــــ

بیگم سعید: کہاں سے خریدی تھی۔

شاہدہ: جی ــــ یہ انڈیا سے آئی ہے۔

بیگم راشد: وہ تو ظاہر ہی ہے ــــ انڈیا کی ساڑھیوں کا تلہ اور ہی ہوتا ہے۔

یہ دیکھیں (اپنی ساڑھی دکھاتے ہوئے) یہ ساڑھی میں نے ساڑھے پانچ سو کی خریدی تھی ___ کتنی ماند نظر آرہی ہے اس کے سامنے۔

بیگم نصیرہ حامد: یہ انڈیا سے کتنے میں آئی تھی۔

شاہدہ: (قدرے گھبرا جاتی ہے۔ لیکن مسکرا کر کہتی ہے) جی مجھے پتہ نہیں۔ (ہنس کر) یہ ساڑھی امی نے ہماری شادی کی پانچویں سالگرہ پر دی تھی۔

بیگم راشد: کتنی خوش قسمت ہیں آپ بیگم نعیم۔

شاہدہ: (ہنستے ہوئے) کیوں؟

بیگم راشد: پانچویں سالگرہ پر اتنا قیمتی تحفہ ___ خوش قسمتی ہی ہے نا۔

بیگم نصیرہ: والد کی اکلوتی بیٹی لگتی ہیں۔

شاہدہ: (ہنس کر) جی ___ جی ہاں ___

بیگم سعید: بھئی خوبصورت اور لاجواب شے ہے۔ نظر نہ لگ جائے۔

بیگم نصیرہ حامد: واقعی ___ ماشاءاللہ بڑی پیاری لگ رہی ہیں۔

بیگم واحد: کیوں نصیرہ ___ آج باتیں ہی ہوں گی (ہنس کر) ساڑھی کی تعریف تو ہو لی ___ اب پیٹ پوجا ___

بیگم سعید: ابھی خاص دیر تو نہیں ہوئی بیگم واحد۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔

بیگم واحد: بھئی وقت تو کافی ہو گیا ہے۔ (گھڑی دیکھتی ہے)

بیگم نصیرہ: (ہنس کر) میرا قصور نہیں ___ بیگم واحد ___ کھانا تیار ہے۔ صرف دو تین مہمانوں کا انتظار ہے۔ اب تک انہیں آجانا چاہیئے تھا۔

(ہارن کی آواز)

بیگم نصیرہ: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میرا خیال ہے آگئے ___ (باہر نکل جاتی ہے)

بیگم راشد: بیگم نصیرہ حامد کی ساڑھی بھی کافی خوبصورت ہے۔

بیگم سعید: لیکن شاہدہ نعیم کی ساڑھی کے سامنے ماند نظر آرہی ہے ___

(شاہدہ سے) آج تو پوری محفل میں آپ نمایاں ہیں۔ سب کا نمبر کاٹ گئیں۔

شاہدہ: (عجز سے) ہائے اللہ ——— آپ تو مغالطے پہ اتر آئیں۔ کوئی ایسی بڑھیا بھی نہیں ساڑھی ——— امی نے جو ننھے کے پیدا ہونے پہ مجھے ساڑھی دی تھی ——— آپ وہ دیکھتیں۔ تو حیران رہ جاتیں۔

بیگم راشد: (حسد سے) تو ——— تو اس سے بھی بڑھیا ساڑھی ہے آپ کے پاس ۔

شاہدہ: (عجز کا اظہار) جی ——— یہ تو کچھ بھی نہیں ——— امی کی پسند بھی بہت اچھی ہے نا ———

بیگم واحد: (منہ بنا کر) خالی پسند کا کیا ——— پیسہ بھی ہونا چاہیئے۔ آپ کی خوش نصیبی ہے۔ جو امیر کبیر والدین کی اکلوتی بچی ہیں۔

بیگم سعید: خوب مزے ہیں آپ کے ———

شاہدہ: جی ——— اللہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ آپ جانیں آجکل تنخواہوں میں کیا بنتا ہے۔ ڈیڑھ دو ہزار میں بھی پوری نہیں پڑتی۔

بیگم راشد: (حاسدانہ) آپ کو تو واقعی ڈیڑھ دو ہزار بھی کچھ نہیں لگتا ہوگا۔

(بیگم نصیرہ دروازے سے اندر آتی ہے۔ اس کے ساتھ اسماء خوبصورت ساڑھی پہنے اندر آتی ہے ——— شاہدہ کی نظر اسماء پر پڑتی ہے۔ رنگ فق ہو جاتا ہے ——— ہاتھ پاؤں سنسنا جاتے ہیں ——— اسماء بھی اسے دیکھتی ہے۔ اپنی ساڑھی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طنز کی چمک آجاتی ہے ———)

بیگم ارشد: کیا ہوا، بیگم نعیم ——— آپ کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔

بیگم واحد: یہ تو شاید بے ہوش ہو رہی ہیں۔

بیگم نصیرہ: (لپک کر ادھر آتی ہے) نظر لگ گئی انہیں ——— (اسماء بھی ادھر آتی ہے۔ شاہدہ کا گھبراہٹ سے بُرا حال ہے۔)

شاہدہ: (اٹھ کر دوسرے دروازے کی طرف بھاگنے لگتی ہے ———) اُف

——میرا دل —— گھبرا رہا ہے —— چکر —— چکر —— چکر ——

(بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)

بیگم سعید: ہائے اللہ انہیں کیا ہو گیا —— بیگم راشد ذرا سہارا دے کر لے چلتیں انہیں۔

بیگم راشد: وہ تو خود بھاگ گئی ہیں۔ کہیں گر نہ گئی ہوں۔

بیگم نصیرہ: میں جاتی ہوں —— انہیں لٹا دوں —— ذرا تم بھی آنا میرے ساتھ ——

بیگم راشد اور بیگم نصیرہ جاتی ہیں۔ شاہدہ جا چکی ہے)۔

(عورتوں کی آپس میں چہ مے گوئیاں ہوتی ہیں ——)

ایک عورت: سب سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔

دوسری عورت: بیچاری کو نظر لگ گئی۔

تیسری عورت: ساڑھی بے حد خوبصورت تھی —— شکل بھی اچھی —— اس پر اتنی خوبصورت ساڑھی ——

(سب عورتیں باتیں کرتی ہیں۔ اسماء کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ چمک رہی ہے ——)

اسماء: (زیر لب مسکراتے ہوئے) واقعی —— یہ اس خوبصورت ساڑھی کا قصور ہے ——

ہنستی ہے۔ عورتیں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگتی ہیں ——)

پہلی تاریخ

(ایک چھوٹا سا کمرہ ـــــ دو معمولی سے پلنگ ہیں۔ جن پر رنگین چارخانی چادریں پڑی ہیں۔ دائیں دیوار پر کھونٹی ہے۔ جس پر زنانہ اور مردانہ کپڑے لٹک رہے ہیں۔ مشرقی کونے میں دو تین صندوق اوپر تلے پڑے ہیں۔ جن پر سفید کپڑے ترتیب سے ڈالے ہوئے ہیں۔ دو کرسیاں اور ایک میز بھی دیوار کے ساتھ لگے پڑے ہیں۔ میز پر دو تین کتابیں اور ایک معمولی سا ٹرانسسٹر پڑا ہے ـــــ کمرے کے عین وسط میں پچیس چھبیس سالہ ناصرہ اپنے پانچ چھ سالہ بچے روفی کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخ رہی ہے۔ ناصرہ کے چہرے پر پژمردگی کا تاثر ہے۔ اپنی عمر سے کئی سال بڑی دکھائی دے رہی ہے۔ کاٹن کے معمولی سے کپڑے پہن رکھے ہیں ـــــ بچہ روئے جا رہا ہے ـــــ)

ناصرہ: (روفی کے ایک تھپڑ لگاتے ہوئے) ریں ـــــ ریں ـــــ بس ہی نہیں کر رہا۔ چپ ہو جا ـــــ ورنہ ـــــ کم بخت ـــــ خدا جانے کہاں سے دیکھ آتا ہے رنگ برنگی چیزیں ـــــ کبھی ایک کے لیے ضد کبھی دوسری کے لیے ـــــ جیسے نواب زادہ ہو۔ اتنا ضدی ہو گیا ہے۔ بس جو بات زبان سے نکالے ـــــ وہ پوری ہی ہونی چاہیئے ـــــ ہونھ ـــــ باپ کے خزانے کھلے پڑے ہیں

نا ــــ چپ ہو جا ورنہ اور تھپڑ لگاؤں گی ــــ پھر نام لے گا ہوائی جہاز کا۔
روفی : (روتے روتے) ہوائی جہاز ــــ لوں گا ــــ
ناصرہ : (جھنجھوڑتے ہوئے) ڈھیٹ کہیں کا ــــ (تھپڑ لگاتی ہے) ہوائی جہاز ــــ ہوائی جہاز ــــ نام لے ہوائی جہاز کا جو تیری زبان نہ کھینچ لی۔
رہانپ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے ــــ بچے کا منہ اپنے دوپٹے سے پونچھنے لگتی ہے) ہزار بار پیار سے سمجھایا ہے لوگوں کے پاس چیزیں دیکھ کر ضد کرنا بری بات ہے ــــ لیکن سمجھتا ہی نہیں ــــ ریل گاڑی کی ضد چھوڑی۔ تو اب ہوائی جہاز دیکھ لیا ــــ ایک ہی ضد ہفتہ بھر سے لگا رکھی ہے ــــ رٹ چھوڑتا ہی نہیں ــــ کہاں سے لاکر دیں تمہیں پندرہ بیس روپے کا کھلونا۔ کان کھول کر سن ــــ تو آج سے عاطف کے گھر گیا تو چمڑی ادھیڑ دوں گی ــــ (اپنے آپ سے) لوگوں کی تو حرام کی کمائی ہے۔ بیس بیس، تیس تیس روپے کا کھلونا ہی بچوں کے لیے آتا ہے۔ ہونہہ ــــ ایک ہی محکمے کی نوکری ــــ یہاں روٹی بھی نہیں چلتی ــــ اور وہاں رات شب برات اور دن عید ہیں۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے اور اخراجات ڈھائی ہزار سے بھی اوپر ــــ (روہانسی آواز) دوسروں کے لیے مصیبت بن گئے ہیں یہ لوگ ــــ (بچہ روں روں کیے جا رہا ہے ــــ ناصرہ پھر اس کی طرف دیکھ کر غصّے میں آجاتی ہے) چپ ہو گا یا نہیں ــــ تیری ضد تو پوری ہونے سے رہی ــــ کھال کھنچوا لے گا مجھ سے آج (بچے کو جھنجھوڑ کر پلنگ پر پٹخ دیتی ہے۔ بچہ زور زور سے رونے لگتا ہے)۔
ناصرہ : ذلیل ــــ واہیات ــــ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔
(صغیر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اٹھائیس تیس سالہ نوجوان ہے۔ لیکن چہرے پر بشاشت نام کی کوئی چیز نہیں۔ بچے کو روتے دیکھ کر لپک کر ناصرہ کی طرف آتا ہے)۔

صغیر: کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ مار رہی ہو نا روفی کو ——

(بچہ باپ کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگتا ہے۔ صغیر روفی کو بازوؤں میں لے کر ناصرہ کی طرف دیکھتا ہے —— ناصرہ منہ بنائے کھڑی رہتی ہے ——

صغیر: (روفی کو پیار کرتے ہوئے) کیا ہو گیا میرے بیٹے کو —— کیوں پٹائی ہوئی۔ —— ناصرہ —— کیوں مارا؟

ناصرہ: دماغ خراب ہو گیا ہے میرا ——

صغیر: (ہنس کر) وہ تو ظاہر ہی ہے۔ ہزار بار کہا ہے بچے کو کچھ نہ کہا کرو۔ ڈھیٹ ہو گیا ہے اسی لیے۔ (سنجیدگی سے) لیکن تم ہو —— کہ —— (بچہ سسکتا ہے)

ناصرہ: بس رہنے دیجئے —— آپ نے شہہ دے دے کر ہی اسے خراب کر ڈالا ہے —— بات تو مانتا ہی نہیں۔ ضدی اتنا ہو گیا ہے کہ جو بات منہ سے نکل جائے وہ پوری کروا کے رہتا ہے ——

صغیر: اوہو —— بچہ ہی ہے نا —— بڑا ہو گا۔ تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ مارنے سے تو اور خراب ہو گا ——

ناصرہ: (جھلّا کر) تو لا دیجئے صاحب زادے کو، پندرہ بیس روپے کا ہوائی جہاز۔

صغیر: (روفی سے) کیسا ہوائی جہاز بیٹے ——

روفی: (آنکھوں میں مٹھیاں گھسیڑتے ہوئے) جیسا عاطف کے پاس ہے۔

صغیر: کھلونا؟

روفی: ابّو چابی سے اڑتا ہے —— (رونا بھول کر ہاتھوں کے اشارے سے بتاتا ہے) یوں —— ابّو یوں ——

صغیر: (ہنس کر) کتنا بڑا ہے۔

روفی: اتنا (دونوں ہاتھوں سے پھر معصومانہ اشارہ کرتا ہے)

ناصرہ: اسے لاکھ بار سمجھا چکی ہوں۔ کہ عاطف کی چیزوں کو دیکھ کر ضد نہ کیا کرے —— پر ایسا ڈھیٹ ہے —— مانتا ہی نہیں۔

صغیر: ناصرہ ___ تم تو پگلی ہو ___ بچہ ہے نا آخر ___ اسے کیا پتہ ؟

ناصرہ: بچّہ ہے ___ ابچے کو سمجھ لینا چاہیئے نا ___

روفی: ابو ___ میں بھی ہوائی جہاز لوں گا ___

ناصرہ: دیکھا (صغیر کی طرف غصّے سے دیکھتی ہے ۔) ___

صغیر: (روفی سے) اچھا بیٹے آپ کو بھی لادیں گے ہوائی جہاز ___

ناصرہ: اسے ہے ___ لادیں گے ہوائی جہاز ___ کیوں بچے سے جھوٹا وعدہ کر رہے ہیں ۔

صغیر: جھوٹا وعدہ کیوں ___ لادیں گے اپنے روفی بیٹے کو جہاز ___ کیا یاد کرے گا ۔ کس رئیس باپ سے پالا پڑا ___

ناصرہ: (جھلا کر) رہنے دیں ___ پندرہ بیس روپے کا ہوائی جہاز اور لادیں گے روفی بیٹے کو ___ ایسے چونچلوں کی ضرورت نہیں ۔

روفی: (ماں کو گھور کر دیکھتے ہوئے باپ سے لپٹ جاتا ہے) ابوّ ___ لادیں گے نا ___

صغیر: ضرور ___ ضرور ___

روفی: (چہرے پر لازوال سی خوشی ۔ صغیر اسے سینے سے لگا لیتا ہے) ابو کب لادیں گے ۔ آج ؟

صغیر: آج نہیں بیٹے ۔

روفی: پھر کب ابوّ ۔

صغیر: پہلی تاریخ کو ___ تنخواہ ملے گی نا ___ سب سے پہلا کام یہی کرونگا ۔

روفی: (جوشِ مسرت سے تالیاں بجانے لگتا ہے) آہا ___ میرے پاس بھی ہوائی جہاز ہو گا ___ آہا ___ ہا ___ آہاہا ___ (کود کر پلنگ سے نیچے اترتا ہے اور کمرے سے دوڑ کر باہر نکل جاتا ہے ۔ صغیر اسے

محبت سے دیکھتا ہے اور پھر ناصرہ کی طرف رُخ پھیر لیتا ہے۔)

ناصرہ: (سر کو جنبش دیتی ہے) ہونھ۔

صغیر: تم تو سنکی ہو —— سنکی۔

ناصرہ: جی ہاں؟

صغیر: خواہ مخواہ بے چارے کو پیٹ رہی تھیں —— کتنا خوش ہو گیا —— اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

ناصرہ: (بات چبا چبا کر) جی! دیکھا تھا ——

صغیر: اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر بیس روپے قربان کر دیں گے جی ——

ناصرہ: بیس روپے ہیں۔ بیس پیسے نہیں ——

صغیر: جانتا ہوں۔

ناصرہ: ہم ایسی خرافات کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

صغیر: اوہ —— ناصرہ (پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے) یہ سوچنا شروع کر دوں۔ تو جینا دوبھر ہو جائے۔ گاڑی کھینچتی چلی جا رہی ہے —— بس یہی کافی ہے —— بچے کی خوشی پوری ہو جائے گی —— اپنا حال تو جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔

ناصرہ: یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ آج پندرہ بیس روپے اس کی ضد پر خرچ کر دیئے۔ تو کل کوئی اور بڑی چیز دیکھ کر مچل بیٹھے گا۔

صغیر: جب مچلے گا —— دیکھا جائے گا۔ مجھ سے تو اس کے چہرے کی محرومی نہیں دیکھی گئی۔

اور ناصرہ —— تم تو پڑھی لکھی عورت ہو —— جانتی ہو —— بچے کی شخصیت محرومیت سے کس بری طرح مسخ ہوتی ہے —— کچھ تو نفسیات۔

ناصرہ: (ناک منہ چڑھاکر) اپنے ویں جی۔ نفسیات ؟ــــ غریبوں کے بچّوں۔
صغیر: (بات کاٹ کر) چلو چھوڑو ان باتوں کو ــــ چائے بناؤ ــــ آج دفتر میں بڑا کام کیا ہے ــــ سر دکھ رہا ہے ــــ گرم گرم چائے پلا دو ــــ
ناصرہ: (کمرے سے باہر نکلتے ہوئے) آپ نے روفی سے وعدہ کر کے اچھا نہیں کیا۔
صغیر: اوہ ــــ (پلنگ پر لیٹ کر گنگنانے لگتا ہے ــــ ناصرہ کمرے سے نکل جاتی ہے)۔

(اسی کمرے کے سامنے صحن میں صغیر دفتر جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ صحن میں بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ اس کا پرانا سائیکل کھڑا ہے۔ روفی سائیکل کے پیڈل کو گھما رہا ہے۔ ناصرہ صحن میں کھلنے والے باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی ہے ——)

روفی: (سائیکل چھوڑ کر باپ کی طرف آتا ہے) ابّو —— آج کیا تاریخ ہے ——؟

(صغیر اور ناصرہ ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں)

صغیر: آج چھبیس ہے بیٹے۔

روفی: پہلی تاریخ کب آئے گی۔

صغیر: (جھک کر اسے پیار کرتے ہوئے) چار دن بعد۔

روفی: (خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے گھومنے لگتا ہے) آہا —— چار دن بعد پہلی تاریخ آئے گی۔

ناصرہ: آئے گی تو پھر کیا؟

روفی: ہمارا ہوائی جہاز آئے گا۔

ناصرہ: اُوں —— (بچہ ٹکر ٹکر ماں کا منہ دیکھنے لگتا ہے)

صغیر: (اسے ٹوک دیتا ہے) ناصرہ!

روفی : ابوّ ـــ پہلی تاریخ کو ہوائی جہاز آئے گا نا۔

صغیر : ضرور ـــ ضرور !

(روفی خوشی سے چھلانگیں لگاتے کمرے میں چلا جاتا ہے)

صغیر : کتنا خوش ہو رہا ہے روفی ـــ جہاز مل جانے پر اس کی خوشیوں کا اندازہ تو کرو۔

ناصرہ : میں نے منع بھی کیا تھا۔ ایسا وعدہ بچے سے نہ کریں ـــ ٹال دیتے تو اچھا تھا۔

صغیر : کیوں ؟ ہو کیا گیا۔ پندرہ بیس روپے کے لیے بچے کی خوشیوں کو مجروح کر دیا جائے۔

ناصرہ : (جھلّا کر) وہ پندرہ بیس آئیں گے کہاں سے۔

صغیر : تنخواہ جو ملے گی۔

ناصرہ : تنخواہ !! ـــ (انداز طنزیہ ہے) تنخواہ پہلے ہی پوری نہیں ہوتی اس پر بیس روپے کا یہ خرچ ـــ

صغیر : (سائیکل کی طرف مڑتے ہوئے) ناصرہ ! تنخواہ پہلے ہی پوری نہیں ہوتی ـــ بیس روپے اور کم ہو جائیں گے تو کیا فرق پڑے گا ـــ بہت ہوا تو میں اگلے ماہ سگریٹ نہیں پیوں گا ـــ

ناصرہ : (مسکرانے لگتی ہے) اوہو ـــ بیٹے کے لیے اتنی قربانی ـــ ؟

صغیر : دس بارہ کا خسارہ تو اس طرح پورا ہو ہی جائے گا ـــ کیوں ؟ اب تو مسکرانے لگیں۔ بڑی کنجوس ہو ـــ (پیار سے دیکھتا ہے)

ناصرہ : کنجوس نہ ہوتی تو سر پر قرضے کا بوجھ چڑھا رکھا ہوتا۔

صغیر : اچھا بھئی ـــ اب جائیے دو دفتر، دیر ہو رہی ہے (سائیکل لے کر ڈیوڑھی کی طرف بڑھنے لگتا ہے)۔

تانگہ رکنے اور باتوں کی آواز پر ٹھٹک جاتا ہے ناصرہ بھی اس کے قریب آجاتی ہے)

ناصرہ: تانگہ آیا ہے۔

صغیر: ہمارے ہاں کون آئے گا ــــ سامنے والوں کے مہمان آئے ہونگے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ دو تین بچے اور دو عورتیں آگے پیچھے اندر آتے ہیں ــــ صغیر اور ناصرہ لپک کر ان کے قریب جاتے ہیں)

صغیر: آپا ــــ صغیرہ آپا ــــ آپ ــــ؟ السلام علیکم۔ السلام علیکم۔

صغیرہ: (برقعہ اتارتے ہوئے) وعلیکم السلام ــــ کیا حال ہے۔ ناصرہ اچھی ہو نا ــــ

ناصرہ: (سلام کر کے) صغیرہ آپا ــــ آپ کیسی ہیں ــــ (دوسری خاتون سے) نچھو تم اچھی ہو نا۔

(پھر بچوں کو باری باری ناصرہ اور صغیر پیار کرنے لگتے ہیں۔ روفی کمرے سے نکل آتا ہے ــــ پھوپھی اسے لپٹا کر پیار کرنے لگتی ہے۔)

صغیرہ: اماں کہاں ہیں ــــ؟

ناصرہ: اوپر گئی ہیں۔

صغیرہ: اچھی تو ہیں۔

ناصرہ: تم اپنی کہو آپا ــــ یہاں سب ٹھیک ہیں۔ نذیر بھائی نہیں آئے؟

صغیرہ: آئے ہیں۔ تانگے سے سامان اتروا رہے ہیں۔

ناصرہ: (چارپائی کھینچ کر لاتی ہے) بیٹھو آپا ــــ نچھو تم بھی برقعہ اتارو۔

صغیرہ: رات بھر کے سفر نے تو چکنا چور کر دیا ــــ ان بچوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کہ ماموں کے گھر جانا ہے ــــ میں نے بھی سوچا چلو چھٹیاں ہیں۔ دس پندرہ دن گزار ہی آئیں ــــ

توبہ اتنا لمبا سفر ہے۔

ناصرہ: (بجھ سی جاتی ہے) اچھا کیا! —

صغیر: نذیر بھائی باہر کے ہی ہو رہے —— (ڈیوڑھی کی طرف جانے لگتا ہے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آتا ہے دونوں تپاک سے مصافحہ کرتے ہیں۔)

(سب باتیں کرنے لگتے ہیں۔ احوال پرسی ہوتی ہے۔ بچے اودھم مچانے لگتے ہیں۔)

(باورچی خانہ ــــ ناصرہ بڑے سے دیگچے میں چاول اُبال رہی ہے ــ مٹی کی ہانڈی انگیٹھی پر رکھی ہے۔ باورچی خانے میں برتن بکھرے پڑے ہیں۔ باہر سے باتوں اور بچوں کے شوروغل کی آواز آتی ہے)۔

روفی: امّی ــــ

ناصرہ: ہوں ــــ

روفی: امی آج پہلی تاریخ ہے نا۔

ناصرہ: (غصے سے جھنجھلا کر) ہاں ــــ ہاں ــــ پہلی تاریخ ہی ہے۔

روفی: آج ــــ آج ابّو ــــ تنخواہ ــــ لائیں گے نا ــــ

ناصرہ: (جھلّا کر) لائیں گے ــــ ضرور لائیں گے۔

روفی: مجھے ہوائی جہاز لے دیں گے نا ــــ

ناصرہ: (غصّے سے) ہوائی جہاز نہیں کچھ اور بھی لے دیں گے (اپنے آپ سے) تنخواہ ؟ ہونہہ۔ اس بار تو تنخواہ آنے سے پہلے ہی اڑ گئی ــ دس مہمان سر پر آن بیٹھے ہیں۔ پہلے ہی گزارہ مشکل سے ہوتا تھا ــــ اب تو ــــ ایک نہ دو اکٹھے دس آدمی۔

روفی: (ماں کے کندھے پر جھول کر) امّی۔

ناصرہ: ہٹ جا پرے (چاول کے دیگچے میں چمچ ہلاتی ہے)۔

روفی: میں آج ہوائی جہاز ضرور لوں گا۔

ناصرہ: میرا دماغ نہ چاٹ —— جا کھیل باہر جا کر۔

(روفی باہر جانے لگتا ہے۔ کہ صغیر دروازے میں دکھائی دیتا ہے۔

روفی دوڑ کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے)۔

روفی: ابّو —— آج پہلی تاریخ ہے نا —— تنخواہ لائے ہیں نا ابّو۔

صغیر: ہاں بیٹے —— ہٹو ذرا —— باہر کھیلو۔

روفی: ابو تیار ہو جاؤں۔

ناصرہ: (جھڑک کر) کہاں کے لیے؟

روفی: بازار جاؤں گا۔

ناصرہ: کس لیے۔

روفی: ہوائی جہاز لینے۔

صغیر: آں —— بیٹا —— دیکھو —— گھر میں اتنے مہمان آئے ہیں۔ ہوائی

جہاز لینے کے لیے جائیں۔

روفی: (حیرانگی سے) کیوں ابو۔

صغیر: بیٹا اس دفعہ بہت پیسے خرچ ہو گئے ہیں —— ہوائی جہاز کہاں سے لائیں۔

(روفی منہ بسورنے لگتا ہے)

ناصرہ: خبردار جو منہ بنایا۔

روفی: (بسورتے ہوئے) ہوائی —— جہاز ——

صغیر: (دادا اس سا نظر آتا ہے) بیٹے —— اچھے بیٹے بنو نا —— (پیار کرتا ہے)

ناصرہ: یہ سمجھ چکا پیار سے۔

صغیر: تم خواہ مخواہ نہ جھلاؤ —— ہم اپنے بیٹے کو سمجھالیں گے —— ہماری بات

تو مان جائے گا۔ کیوں روفی —— اچھے بچے ہو نا۔

روفی: (منہ بناتے ہوئے) ابّو —— ہوائی —— جہاز ——

صغیر: دیکھو نا بیٹا —— اتنے مہمان آئے ہیں گھر میں —— اوہ —— ہاں، دیکھو۔ اگر تم آج ہوائی جہاز لے آئے تو پھپھو کے بیٹے راشی —— رفو تم سے چھین لیں گے۔ (پچکارتے ہوئے) سارا ہوائی جہاز توڑ پھوڑ ڈالیں گے۔

روفی: (آنکھیں پھیلا کر) ہاں ابّو ——

صغیر: دیکھو۔

روفی: جی۔

صغیر: (سرگوشی کے انداز میں) جب یہ سب چلے جائیں گے نا۔ تو پھر ہم تمھیں ہوائی جہاز لا دیں گے۔ یہ سب گندے بچے ہیں۔ تمھارا جہاز توڑ دیں گے۔

روفی: (مان جاتا ہے) یہ کب جائیں گے ابّو۔

(صغیر اور ناصرہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں)

ناصرہ: بس اب زیادہ باتیں مت کرو —— کہہ دیا ہے نا جب سب چلے جائیں گے تو تمھیں لا دیں گے ہوائی جہاز (صغیر سے) آپ کو میں نے اس دن منع بھی کیا تھا۔ جھوٹا وعدہ کرنے سے کیا فائدہ —— ؟

صغیر: اب مجھے الہام ہونا تھا کیا۔ کہ مہمان آجائیں گے۔ اور تنخواہ آنے سے پہلے ہی آدھی ختم ہو جائے گی۔

ناصرہ: آہستہ بولیے نا —— کسی نے سن لیا تو برا منائیں گے۔ ابھی تو چار دن ہی گزرے ہیں —— آپا صغیرہ کا ارادہ دس گیارہ تک یہیں رہنے کا ہے۔

صغیر: (گہری آہ بھر کر) اچھا بھئی ——

روفی: ابّو!

صغیر: ہاں بیٹے۔
روفی: کب لے کر دیں گے ہوائی جہاز۔
صغیر: اگلی پہلی کو —— وعدہ رہا ——
روفی: (ہاتھ بڑھا کر) پکا وعدہ؟
صغیر: بھئی پکا —— بالکل پکا (بچّے کا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلاتا ہے۔)
(روفی بُرا سا منہ بنا کر باورچی خانے سے نکل جاتا ہے)

صغیر: کتنا مایوس ہوا ہے بیچارہ۔
ناصرہ: آپ کی غلطی ہے۔
صغیر: غلطی کی کیا بات —— بچّے کی کوئی خواہش پوری کرنا غلطی ہے؟
ناصرہ: ہم جیسے لوگوں کے بچوں کی کوئی خواہش ہونی ہی نہیں چاہیئے (مایوس چہرے سے صغیر کو دیکھتی ہے)۔ جہاں گزر اوقات ہی مشکل سے ہوتی ہو وہاں خواہشوں کا کیا کام؟
صغیر: عجب مشکل ہے —— زندگی روز بروز تلخ ہی ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہ مہمانوں پر جو خرچہ اٹھے گا وہ کیسے پورا ہو گا ——؟ تم ذرا ہاتھ کھینچ کر خرچ کیا کرو نا ——
ناصرہ: (تلخی سے ہنس کر) ہاتھ کھینچ کر خرچ؟ ہونہ —— کل گوشت نہیں منگایا۔ تو اماں نے سو باتیں کیں۔ (اماں کی نقل کا اندازہ) کون سا روز کوئی کسی کے گھر آتا ہے۔ تین سال بعد میری بیٹی آئی ہے —— اور پھر داماد کا بھی خیال کرو —— نذیر کیا کہے گا —— پہلے کون سے مرغ پلاؤ پک رہے ہیں —— جو موا گوشت بھی نہیں منگایا۔
صغیر: اماں پرانے زمانے کی عورت ہیں۔ انہیں کیا پتہ آجکل کس بھاؤ چلتی ہے —— اڑھائی سو روپے ہیں کیا

کچھ ہو سکتا ہے۔

ناصرہ: پچاس روپے جو حامد سے آپ لائے تھے۔ خرچ ہو گئے سارے دو روپے باقی بچے ہیں۔

صغیر: اچھا — اچھا — کیا ہو سکتا ہے اب —

(ناصرہ چاولوں کو دم دے کر چولھا بند کرتی ہے۔ صغیر باورچی خانے سے باہر نکل جاتا ہے)

— ... —

(وہی کمرہ ـــــ صغیر اور ناصرہ آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ دس دس کے نوٹ صغیر گن رہا ہے۔ کچھ ریزگاری بھی سامنے پڑی ہے ـــــ)

صغیر: یہ لو ـــــ دو سو چالیس ہیں ـــــ (روپے روپے کے نوٹ گنتا ہے ـــــ) یہ آٹھ روپے ہیں اور دو روپے کی یہ ریزگاری ہوگی۔

ناصرہ: پورے اڑھائی سو ہو گئے۔

صغیر: ہاں ـــــ کٹ کٹا کر اڑھائی سو ہی تو ملتے ہیں۔

ناصرہ: اس دفعہ تو!

صغیر: (جلدی سے) حساب بعد میں کرنا۔ پہلے بیس روپے مجھے دے دو۔

ناصرہ: کیوں؟

صغیر: روفی کے ہوائی جہاز کے لیے۔

ناصرہ: (حیرانگی سے) ہائے ہائے ـــــ اب کیا کہوں آپ کو ـــــ بیس روپے کہاں بچیں گے۔

صغیر: وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن روفی ـــــ دوسری بار پہلی تاریخ آگئی ہے ناصرہ ـــــ پورا مہینہ اس نے کتنا صبر آزما انتظار کیا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ اس دفعہ میں اسے ہوائی جہاز ضرور لے دوں گا ـــــ

ناصرہ: (ماتھے پر ہاتھ مار کر) اب آپ سمجھیں گے تھوڑا ہی۔

صغیر: تم سمجھانے کی کوشش بھی نہ کرو۔

ناصرہ: پہلے حساب کر لیں ـــــ کچھ بچا تو بیس روپے کی خرافات بھی کر لیجئے گا۔

صغیر: تم ضروری اخراجات کے پیسے الگ کر لو نا۔ باقی میں سے ـــــ

ناصرہ: (بات کاٹ کر) ضروری اور غیر ضروری کیا ـــــ (نوٹ گن کر) یہ پچاس روپے تو حامد بھائی کے واپس کرنا ہیں۔

صغیر: اوہو ـــ مجھے تو یاد ہی نہ رہا تھا۔

ناصرہ: آپ کو ابھی بہت کچھ یاد نہیں ہوگا۔ بنئیے کا حساب بھی چکانا ہے۔ آٹا، چاول اور گھی اس ماہ ادھار ہی آئے تھے۔

صغیر: ساٹھ ستر تو ہوگا ہی اس کا بل۔

ناصرہ: جی اس سے بھی کچھ زیادہ ـــــ چودہ تاریخ صغیرہ آپا گئی ہیں۔ کتنا خرچ ہوا؟

صغیر: (تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر) ہوں، ہم جیسے محدود آمدنی والے لوگوں کے ہاں تو مہمان آنا ہی نہیں چاہئیں ـــ آہ ـــــ کیا زمانہ ہے، بھائی بہنوں کی آمد پر بھی خوشی کی بجائے کوفت ہوتی ہے۔

ناصرہ: مہمان تو آئے سو آئے ـــ ہمارے رسم و رواج بھی تو بیہودہ ہیں۔

صغیر: اٹھارہ بیس دن اتنے آدمی اکٹھے ہو جائیں، تو ـــــ

ناصرہ: اماں تو خوش نہیں ہیں؟

صغیر: (چونک کر) کیوں؟

ناصرہ: ان کی مرضی تھی، کہ صغیرہ آپا اور بچوں کو کپڑے بھی دیئے جاتے ـــ خالی مٹھائی لا دینے کا کیا؟

صغیر: کپڑے؟

ناصرہ: کہتی نہیں —— باپ زندہ ہوتا تو یونہی چلی جاتی میری صغیرہ —— باپ اور بھائی میں یہی تو فرق ہے۔

صغیر: اوہو —— حد ہوگئی —— اپنا تو تیا پانچا ہوگیا۔ اور اوپر سے یہ باتیں۔

ناصرہ: میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ خاموشی سے سن لیا سب کچھ۔

صغیر: اچھا ہی کیا ——؟

ناصرہ: ہاں تو —— حساب کر لیجیے نا؟

صغیر: رہنے ہی دو —— اس طرح تو سو بھی نہیں بچے گا۔ ابھی پورا مہینہ گزارنا ہے ——

ناصرہ: اسی لیے تو میں کہہ رہی تھی۔ پندرہ بیس روفی کے لیے کہاں سے بچیں گے۔

صغیر: (کروٹ بدل کر) بڑی بُری بات ہے —— بیچارہ —— کتنا مایوس ہوگا۔

ناصرہ: (آہ بھر کر) اس کی مایوسی کو دیکھیں یا اپنے آپ کو۔

صغیر: مجھے تو روفی کا سامنا کرنے سے ڈر لگ رہا ہے۔

ناصرہ: آپ بھی تو خواہ مخواہ اسے سر چڑھا لیتے ہیں۔ روپے دو روپے کی چیز ہوتی تو کسی نہ کسی طرح خرید بھی دیتے۔ چودہ پندرہ روپے سے کم تو نہیں ہوگا یہ جہاز ——

صغیر: ہاں کیا کم ہوگا۔ جاپانی کھلونا ہے۔

ناصرہ: چھوڑیے جی اسے۔

صغیر: اب روفی سے کہوں گا کیا؟ —— وہ تو میری جان کھالے گا۔ پورا مہینہ انتظار کرتا رہا ہے بیچارہ ——

ناصرہ: لاؤ ہنس کر، اگلے مہینے کی پہلی تاریخ تک ٹال دیجیے گا۔

صغیر: اگلی پہلی کو کوئی اور خرچ آن پڑے گا۔

ناصرہ: پھر کیا کیا جائے۔

صغیر: (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) ناصرہ ــــ اگلے ماہ تو روفی کی خواہش بہر طور پوری کرنا ہوگی۔ تنخواہ میں سے سو، پچپن یا پچاس ہیں اپنے بیٹے کو ضرور ہوائی جہاز لا دوں گا۔

ناصرہ: (اداس لہجے میں) اچھا جی ــــ واقعی بڑا ترس آتا ہے روفی پر ــــ اگلے مہینے لے دیجئے گا۔ جہنم میں جائیں سارے خرچ ــــ جیسے بھی بن پڑے گا پورے ہو ہی جائیں گے۔

صغیر: (ہنس کر) تم نے رضامندی ظاہر کر دی۔ تو سمجھو روفی کو کھلونا مل گیا۔

(ناصرہ مسکراتے ہوئے نوٹ اکٹھے کرنے لگتی ہے)

(وہی کمرہ ـــــ ناصرہ روفی کو تیار کرنے کے بعد بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ روفی بے حد خوش نظر آرہا ہے۔ صغیر اپنا کوٹ برش سے صاف کر رہا ہے ـــــ)

ناصرہ: آخر تمھاری ضد پوری ہو ہی گئی۔

روفی: (خوش دلی سے مسکراتے ہوئے) آہا ـــ ہا ـــ آج ہمارا ہوائی جہاز آئیگا۔

صغیر: (کوٹ پہنتے ہوئے) کتنا خوش ہے میرا بیٹا ـــ چہرہ چمک اٹھا ہے۔

ناصرہ: جی ہاں ـــ باپ بھی خوش بیٹا بھی خوش ـــ خروح کے لیے پیسے بچیں نہ بچیں۔ ہوائی جہاز آجائے گا۔

صغیر: خروح کا رونا بس بھی کرو۔ آج تو باپ بیٹے کو خوش ہو لینے تو دو۔ رونے کو مہینہ پڑا ہے ـــ

ناصرہ: (مسکرا کر) سچ مانیئے مجھے تو پندرہ روپے کے خیال ہی سے ہول آرہا ہے ـــ باپ بیٹے کی ضد ہے ورنہ ایسی فضول خرچی کی اجازت کبھی نہ دیتی۔

روفی: چلئے نا ابو۔

صغیر: چلتے ہیں بیٹے ـــ آج تو جیب میں مال ہے گھبراؤ نہیں۔ جہاز آج ضرور آئے گا۔ (بالوں میں کنگھی کر کے تیار ہو کر مڑتا ہے)

صغیر: چلو روفی۔

روفی: (اٹھلاتے ہوئے) چلو جی ــ چلو۔

(کمرے میں دادی اماں داخل ہوتی ہے۔ وہ کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت ہے۔ معمولی سے کپڑے پہن رکھے ہیں ــ)

دادی: کہاں جا رہے ہو بیٹے۔

صغیر: بازار۔

روفی: دادی اماں ــ میں ہوائی جہاز لاؤں گا ــ چابی لگائی تو یوں گھومنے لگتا ہے (چکر کاٹ کر دکھاتا ہے۔ ناصرہ اور صغیر مسکرانے لگتے ہیں۔)

صغیر: روفی کئی دنوں سے ہوائی جہاز کے لیے ضد کر رہا تھا۔ آج تنخواہ ملی ہے۔ وہ لینے جا رہے ہیں۔

ناصرہ: (ہنس کر) کئی دنوں سے یا کئی مہینوں سے۔

دادی: بازار جا ہی رہے ہو ــ میرے لیے ایک فلالین کی قمیض اور ململ کا دوپٹہ بھی لیتے آنا ــ سردی کافی اتر آئی ہے۔ ان کپڑوں میں ٹھنڈ محسوس ہوتی ہے۔

(ناصرہ کا چہرہ لٹک جاتا ہے۔ صغیر بھی چپ ہو جاتا ہے۔)

دادی: چھوٹے پھول اور ہلکے رنگ ہوں۔

صغیر: اماں ــ (جھجک جاتا ہے)

دادی: کیوں؟

صغیر: قمیض لادوں گا ــ ابھی تو روفی کا کھلونا لینے جا رہا ہوں۔

ناصرہ: فلالین کی دو قمیضیں ابھی آپ کے پاس ہیں ــ اگلے مہینے لادیں گے۔

صغیر: ہاں ہاں اگلے مہینے ضرور لادیں گے۔ اس ماہ ــ دراصل اماں۔ اس ماہ پیسے نہیں بچے۔

دادی: (برا مان کر) میرے لیے تو تیرے پاس کبھی پیسے بچیں گے ہی نہیں۔

صغیر: کیا کہہ رہی ہیں اماں ــ

دادی: سچ کہہ رہی ہوں ——— بیٹے کا کھلونا تو اشد ضروری ہے ——— پندرہ بیس روپے اس کے لیے ہیں۔ میری قمیض کے لیے سات آٹھ نہیں ہیں۔

ناصرہ: یہ بات نہیں اماں ——— روفی تین ماہ سے ضد کر رہا ہے۔ پچھلے ماہ مہمان آگئے۔

دادی: مہمان؟ اُٹھتے بیٹھتے مہمانوں ہی کا رونا روتی ہو بہو ——— مہمان کیا تھے قیامت تھی۔ میں جیسے اندھی بہری تھی نا ——— دونوں پر جیسے عذاب ٹوٹ پڑا تھا ——— تین سال بعد میری بچی آئی (روہانسی ہوکر) خالی ہاتھ لوٹ گئی۔

صغیر: اماں میں کوئی رئیس تو نہیں ہوں ——— اڑھائی تین سو روپے تنخواہ ہی ہے نا ———

دادی: بس بس ——— رہنے دے جانتی ہوں سب کچھ۔ اپنی اولاد ہو تو۔

صغیر: اماں!

ناصرہ: اماں آپ کو کیسے سمجھائیں ہم۔

دادی: اے رہنے دے۔ جیسے میں سمجھتی نہیں۔ بیٹے کے کھلونے کے لیے پندرہ بیس نکل آئے۔ ماں نے قمیض کا نام لیا تو لگے ٹال مٹول کرنے۔ (روتی آواز) میں تو پہلے ہی جھجک رہی تھی۔ بہو بیٹے کا راج اور محتاج کسی نے یونہی تو نہیں کہا نا ———

ناصرہ: (غصے سے) جایئے جی اماں کے کپڑے لے آیئے۔ روفی کا کھلونا کوئی ایسا ضروری نہیں۔

روفی: امّی! میرا ہوائی جہاز ——— میں آج ضرور لوں گا۔

دادی: ضرور بیٹے ——— ضرور لے ——— قمیض کے بغیر تو گزر ہو سکتی ہے۔ کھلونے کے بغیر نہیں ———

ناصرہ: (بچے کو اپنی طرف کھینچتی ہے) ادھر آ ——— کوئی ضرورت نہیں کھلونا لینے کی۔

صغیر: (پریشان ہوکر) ناصرہ ——— تم جانتی ہو۔ کہ بیچارہ ———
ناصرہ: (غصے سے) کوئی بیچارہ وچارہ نہیں۔
دادی: اب میرے سر مت چڑھ بہو ——— پندرہ بیس چھوڑ پچاس کا کھلونا لا دو ———
میں تو خواہ مخواہ ہی قمیض کا کہہ بیٹھی ——— (روہانسی ہوکر) خدا کسی کو محتاج نہیں کرے۔
صغیر: اماں!!

(دادی دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ صغیر پریشان سا کھڑا رہتا ہے۔ ناصرہ بچے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بچہ ہاتھ چھڑا کر باپ کی طرف جاتا ہے۔ باہر سے ماں کے بڑبڑانے، سسکیاں بھرنے کی آواز آتی ہے)۔

روفی: ابو ——— چلیں نا۔ ہوائی جہاز ———
صغیر: (جھلّا کر غصے سے) ہوائی جہاز کا بچّہ ——— دفع ہو جا ———
روفی: (روتے ہوئے) ابو ——— آج پہلی تاریخ ہے ——— ہوائی جہاز۔
ناصرہ: (آنکھوں میں آنسو بھر کر بچّے کو سینے سے لگا لیتی ہے) میرے بیٹے ———
صغیر: (کوٹ اتار کر چارپائی پر پھینک کر بڑبڑاتا ہے) اپنی تو جان عذاب میں ہی رہتی ہے۔

(روفی روں روں کرنے لگتا ہے۔ ناصرہ آنکھیں پونچھتے ہوتے اسے پچکارنے لگتی ہے۔ صغیر پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگتا ہے۔ باہر سے ماں کے بڑبڑانے کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے ———)

بھول

(ایک خوبصورتی سے آراستہ کمرہ ـــــ کھڑکیوں پر سبز رنگ کے پردے لہرا رہے ہیں۔ فرش پر سرخ قالین ہے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ دو پلنگ ساتھ ساتھ پڑے ہیں۔ جن پر نرم و گداز بستر ہیں۔ بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ گدے دار کرسیاں اور ایک چکنی سطح کا میز پڑا ہے۔ میز پر گلدان میں تازہ پھول سجے ہیں۔ دیواروں پر خوبصورت قرینوں میں جاذبِ نظر سینریاں ہیں۔ پلنگ کے ساتھ سائڈ ٹیبل بھی ہیں۔ جن پر مختلف چیزیں رکھی ہیں۔ ایک کونے میں پلنگ کے عین سامنے ٹیلی ویژن سیٹ بھی رکھا ہے۔ ٹرانسسٹر میز پر پڑا ہے۔ پلنگ پر پچیس چھبیس سالہ خوبصورت ثریا بیٹی ہے۔ چہرے سے نقاہت عیاں ہے۔ رنگ زرد اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہیں۔ لباس قیمتی ہے۔ طلائی چوڑیاں ہاتھوں میں ہیں۔ کانوں میں ننھے ننھے آویزے ہیں۔ وہ سوچوں میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ بائیں ہاتھ کے دروازے کا پردہ ہٹتا ہے۔ پانچ سالہ رینو کپڑے کی گدی پر ایک مُردار سی بلّی اٹھائے اندر آتی ہے۔ بچی خاصی پریشان ہے۔ بلّی خوفناک آوازیں میاؤں میاؤں کرتی ہے۔)

ثریا : (کروٹ بدل کر رینو کو دیکھتی ہے پھر ماتھے پر بل ڈال کر) رینو ـــــ

رینو : (قریب آکر) جی امّی۔

ثریا : کیوں اٹھائے پھرتی ہے اس مردار کو۔

رینو : امّی! میری پیاری بلّی ہے یہ (پیار سے بلّی کو دیکھتے ہوئے) بیچاری بیمار ہے۔

ثریا : اسے ایک طرف ڈال دے۔ دیکھ نہیں رہی۔ اس کے منہ سے رال ٹپک رہا ہے۔ سارا فراک گندہ ہو جائے گا۔ جا باہر پھینک آ اسے۔

رینو : ہائے امّی ـــــ بیچاری بیمار ہے۔ باہر کیوں پھینک دوں۔

ثریا : یہ مر جائے گی۔

رینو : (جلدی سے گھبرا کر) کیوں!

ثریا : بیمار جو ہے۔

رینو : (بلّی کو فرش پر رکھ کر ماں کے قریب آکر حیرانی سے) بیمار مر جایا کرتے ہیں امّی۔

ثریا : ہاں!

رینو : (معصومیت سے) آپ بھی مر جائیں گی؟

ثریا : (تڑپ کر) رینو۔

رینو : امّی۔

ثریا : (بچی کو بازوؤں میں لے کر) میں مر گئی ـــــ تو ـــــ تو کیا کرے گی رینو۔

رینو : (روہانسی ہو کر) امّی۔

ثریا : آہ میری بچّی ـــــ

(بلّی خوفناک سی میاؤں میاؤں کرتی ہے ـــــ رینو دوڑ کر بلّی کی طرف جاتی ہے۔ اسے اٹھا کر ماں کے قریب آجاتی ہے)۔

ثریا : (اپنے آپ سے) میں ـــــ میں مر گئی ـــــ تو ـــــ تو ـــــ تو کیا کرے

گی میری بچی ـــــ تو دنیا میں اکیلی رہ جائے گی ـــــ اوہ ـــــ اف۔
(سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی ہے) مجھے ـــــ مجھے کیا ہو رہا ہے۔

رینو : امّی ـــــ امّی!

ثریا : رینو ـــــ بتا تو ـــــ میں مرگئی تو تو کیا کرے گی ـــــ

(قدموں کی آواز۔ دروازے سے فاروقی اندر آتا ہے ـــــ ثریا بچی سے پوچھ رہی ہے۔ کہ وہ مرگئی تو کیا کرے گی ـــــ فاروقی سن لیتا ہے ـــــ)

فاروقی : (قریب آکر) ثریا۔

ثریا : (بچی کو چھوڑ دیتی ہے) آپ ـــــ جی ـــــ

فاروقی : رینو بیٹا۔

ثریا : جی ابو۔

فاروقی : بیٹا آپ اپنی بلی کو باہر دھوپ میں لٹا دیں۔

رینو : ابو یہ بیمار ہے۔

فاروقی : ہاں ـــــ ہاں ـــــ مجھے پتہ ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اسے دھوپ میں ڈال دو۔ ٹھنڈ لگ رہی ہے بیچاری کو۔

رینو : ابو اسے دوائی لے دیں نا۔

فاروقی : شام ڈاکٹر تمہاری امی کو دیکھنے آئیں گے نا ـــــ

رینو : انکل ریاض۔

فاروقی : ہاں ـــــ ان سے کہیں گے تمہاری مونا کو اچھی سی دوائی دے دیں۔

رینو : آہا ـــــ پھر تو مونا بہت جلد اچھی ہو جائے گی نا ـــــ

فاروقی : بالکل بالکل ـــــ جاؤ اسے دھوپ میں لٹا دو ـــــ بیچاری کے درد ہو رہا ہے ٹھنڈ سے ـــــ شاباش جاؤ۔

رینو : اچھا ابو (بلی کو اٹھائے چلی جاتی ہے)

فاروقی: (ثریا کے قریب پلنگ پر بیٹھتے ہوئے) تم پھر ریو سے وہی فضول باتیں کر رہی تھیں نا۔

ثریا: (وہمی انداز میں) فاروقی، بلّی کل سے بڑی منحوس آوازیں نکال رہی ہے — مجھے تو یوں —— یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

فاروقی: تمھارے ان واہموں کا کیا علاج۔

ثریا: یہ واہمے نہیں فاروقی۔

فاروقی: خدا کے لیے ثریا۔ ایسی باتیں سوچا کرو۔ نہ کیا کرو۔ پھر ریو سے ایسی باتیں کرنے کا کیا مطلب —— وہ معصوم تمھاری باتوں کو کیا سمجھے گی۔ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہے۔ ننھے سے ذہن پر بوجھ ——

ثریا: (بات کاٹ کر) اسے آنے والے وقت کے لئے تیار کرتی ہوں فاروقی۔

فاروقی: ثریا!!

ثریا: (زہرخند) میں اپنی بیماری اور اس کی نوعیت سے پوری طرح آگاہ ہوں —

فاروقی: اوہ —— خدایا —— تمھیں کیا ہو گیا ہے ثریا۔ حد سے زیادہ وہمی ہو گئی ہو —— تمھیں کتنی بار کہا ہے —— تمھیں کوئی بیماری نہیں — بالکل ٹھیک ٹھاک ہو ——

ثریا: ہونھ —— ٹھیک ٹھاک ——؟

فاروقی: اب اس کا کیا علاج کہ تم ہر بات کا تاریک پہلو ہی دیکھنے لگی ہو۔

ثریا: مجھے پاگل سمجھتے ہو۔

فاروقی: پاگل نہیں —— وہمی!

ثریا: یہ وہم نہیں فاروقی ——

فاروقی: تو اور کیا ہے ——؟

ثریا: ہوں —— (گہری آہ بھرتی ہے)

فاروقی: تمھارے سارے ایکسرے ٹھیک ہیں۔ تمھیں ٹی بی ہے نہ کینسر۔ صرف

کمزوری ہے۔ وہ بھی ڈیڑھ ماہ بخار رہنے سے ہونا ہی تھی۔

ثریا: بخار کیسا تھا؟

فاروقی: جیسا بھی تھا اب تو اتر چکا —— ڈاکٹر بے وقوف تو نہیں جو ہمیں اندھیرے میں رکھے۔ اور پھر تم جانتی ہو۔ ریاض صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ مخلص دوست بھی ہے۔ ایسی ویسی بات ہوتی۔ تو وہ مجھ سے کیوں چھپاتا۔

ثریا: اس لیے کہ وہ تمہارا دوست بھی ہے۔ صرف ڈاکٹر نہیں۔

فاروقی: (جھنجھلا جاتا ہے قدرے تلخی سے) تمہیں کوئی کیسے سمجھائے؟

ثریا: فاروقی!! (رندھی آواز میں) اگر مجھے کوئی بیماری نہیں۔ تو پھر سینے میں ٹیسیں کیوں اٹھتی رہتی ہیں۔ کمر ہر وقت کیوں دکھتی رہتی ہے۔ چہرے کی زردی مٹ کیوں نہیں جاتی —— گوشت، پوست، سوکھا چمڑہ کیوں بنتا جا رہا ہے۔ (سانس الجھنے لگتا ہے) آنکھوں کی چمک عود کیوں نہیں کر آتی —— سانس کا توازن کیوں بگڑ جاتا ہے۔ بتاؤ فاروقی بتاؤ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔

فاروقی: (جھلّا کر) یہ سب تمہارے وہم کا کرشمہ ہے۔ جو ٹانکوں کا اثر ہوتا ہے نا خوراک کا —— بخار کی کمزوری ہے اور بس —— کبھی ٹی بی بنا لیتی ہو کبھی کینسر۔ ڈاکٹر نے ہزار بار کہا ہے دھیان اور طرف لگایا کرو —— لیکن تم ہو کہ کسی کی سنتی ہی نہیں، کتابیں، رسالے یوں کے توں پڑے ہیں۔ ریڈیو کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ٹی وی دیکھنا ممنوع۔ صبح شام بستر پر لیٹی یہی سوچتی رہتی ہو کہ خطرناک بیماریاں تمہیں نگل رہی ہیں۔

ثریا: (ٹھنڈی آہ بھر کر) یہ حقیقت ہے فاروقی —— میں موت کے سایوں کو اپنے اوپر لہراتا دیکھتی ہوں۔ زندگی کا یہ شعلہ ایک دم سرد ہو جائے گا۔ میں جانتی ہوں۔

فاروقی: (ماتھے پر بل ڈال کر خفگی سے) خدا کے لیے کوئی اور بات کرو۔

ثریا : کیوں ___ تنگ آگئے۔

فاروقی: (جھلّا کر) واقعی تنگ آگیا ہوں ___ تمھاری بے سروپا باتیں سن سن کر کان پک گئے۔

ثریا : (دردناک لہجے میں) فاروقی۔

فاروقی: (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) مجھے کام سے باہر جانا ہے۔

ثریا : (اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتی ہے۔ (بجھے بجھے لہجے میں) میں جانتی تھی۔ تم ___ تم تنگ آگئے ہو ___

فاروقی: (ہنس کر اس پر جھکتے ہوئے) لاحول ولا۔ بس اب اسی بات پر کڑھتی رہنا۔ ثریا تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ پاگل تو نہیں ہو گئیں۔

ثریا : (درد بھرے لہجے میں) پاگل ___ واقعی پاگل ہی ہو گئی ہوں۔

فاروقی: چلو چھوڑو ان باتوں کو ___ (اٹھتے ہوئے) میں رینو کو دیکھوں جا کر۔ بلی کے سرہانے بیٹھی ہوگی۔

ثریا : (گہری آہ بھر کر خاموش ہو جاتی ہے)۔

فاروقی: (اس پر جھکتے ہوئے انگلیوں سے اس کے گال چھوتے ہوئے پیار سے) ثریا ___ رینو سے خوب پیار کیا کرو ___ تم تو اپنے آپ سے بیزار رہنے لگی ہو۔ بچی کا ہوش ہی نہیں۔ اسی لیے تو وہ بلّی سے اتنی وابستہ ہو گئی ہے۔ مریل سی بلّی ہے۔ لیکن اسے جان سے پیاری ہے۔ تم پیار۔

ثریا : (سوچتے ہوئے) پیار ___ !!

فاروقی: (چند لمحے اسے دیکھتا رہتا ہے پھر ملائمت سے) تم کن سوچوں میں ڈوب گئیں۔

ثریا : اُف ___

فاروقی: (غصیلے لہجے میں) تم تو اپنی جان کی دشمن ہو ثریا ___ حد ہو گئی ___ پہلے ہی کیا کم وہمی تھیں ___ بیمار ہو کر تو غضب ہی ہو گیا۔ عقل سے بھی کچھ سوچا کرو ___ (میز سے رسالہ اٹھا کر) لو یہ دیکھو ___ (بات

بدلنے کی غرض سے) ایک خوبصورت افسانہ چھپا ہے اس میں ۔ لو اسے پڑھو، طبیعت بشاش ہو جائے گی ۔

ثریا : (بے دلی سے رسالہ لے لیتی ہے) شاباش —— پڑھو اسے ۔ ہوں —— اچھا —— میں کام سے باہر جا رہا ہوں (ہنس کر) دیر ہو گئی تو گھبرانا نہیں —— کوئی نئی سوچ نہ پریشان کرنے لگے تمہیں، سمجھیں (پیار سے اس کی ٹھوڑی ہلا کر کمرے سے نکل جاتا ہے)

ثریا : (اپنے آپ سے) تنگ آ گئے —— آخر تنگ آ گئے نا —— میں کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی —— (آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں) ان میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے ۔ بات بات پر جھلا جاتے ہیں ۔ پہلے گھنٹوں میرے پاس بیٹھے رہتے تھے ۔ اب —— اب میرے پاس آتے ہی انہیں کام یاد آ جاتے ہیں ۔ اُف —— آہ —— فاروقی ۔ تم اگر یوں بدل گئے —— تو میں جیتے جی مر جاؤں گی —— مر جاؤں گی —— مر تو —— میں —— پہلے ہی رہی ہوں فاروقی ۔ (دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگتی ہے ——) فاروقی —— فار —— وقی ——

(آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم۔ صوفے پر فاروقی اور اس کا دوست ڈاکٹر ریاض بیٹھے ہیں۔ رینو خوبصورت فراک میں ملبوس گدی پر نیم مردہ بلّی کو لٹائے اندر آتی ہے۔ چہرہ بے حد اداس اور پریشان ہے۔ فاروقی خاموشی سے سگریٹ پھونک رہا ہے)

رینو : چچا میاں۔

ریاض: رینو بیٹا پہلے اس بلی کو رکھ دو یہاں (قالین کی طرف اشارہ کرتا ہے)

رینو : (جھک کر بلی کی گدی قالین پر رکھتے ہوئے) چچا میاں اسے میٹھی سی دوائی دیں نا ——

ریاض: ضرور دیں گے۔ لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا۔

رینو : کیا؟

ریاض: بلّی کو یوں اٹھائے اٹھائے نہیں پھروگی۔

رینو : (حیرانگی سے) کیوں؟

ریاض: بس دوائی جب ملے گی۔

رینو : اچھا۔

ریاض: وعدہ کرو —— پکا پکا وعدہ (ہاتھ بڑھا دیتا ہے)

رینو : (اس کا ہاتھ پکڑ کر) پکا پکا وعدہ ڈاکٹر چچا —— اب دوائی دیں نا ——

ریاض: شام کو بھیجیں گے ـــــ تم اس کو اس کی پلنگڑی پر پڑا رہنے دو۔ کان کھول کر سن لو ـــــ اب تم نے اسے اٹھانا بالکل نہیں ـــــ سمجھیں ـــــ ذرا بھی ہاتھ لگایا۔ تو دوائی کا اثر نہیں ہوگا۔

رینو: (حسرت سے بلی کو دیکھتے ہوئے) اچھا چچا میاں۔

ریاض: شاباش! ہاں تو اب اسے باہر دھوپ میں ڈال دو۔

رینو: (جھک کر بلّی کو اٹھانے لگتی ہے) میری مونا۔

ریاض: اوں ہوں ہوں ـــــ

رینو: جی چچا میاں۔

ریاض: تم نے پھر ہاتھ لگایا بلّی کو ـــــ

رینو: اسے دھوپ میں لٹاؤں گی ـــــ

ریاض: جاؤ بیٹی مائی کو بلاؤ۔ وہ اسے اٹھا کر لے جائے گی۔

رینو: اچھا ابّو ـــــ (دوڑ کر کمرے سے نکل جاتی ہے)

ریاض: توبہ ـــــ بلی تو رینو کے اعصاب پر سوار ہے۔

فاروقی: (بیزاری سے) ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے ـــــ صبح و شام اسی کے چکر میں ہے۔

ریاض: بچی کا کیا قصور فاروقی ـــــ بیچاری ماں کے پیار اور توجہ سے قریباً محروم ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بلّی سے وابستہ کر لیا ہے۔

فاروقی: (سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے پریشان آواز میں) میں کیا کروں ڈاکٹر ـــــ میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا ـــــ ثریا تو بے حد واہمی ہو گئی ہے۔

ریاض: حالاں کہ انہیں کوئی بیماری نہیں۔ صرف کمزوری ہے۔

فاروقی: اس بات کا اسے یقین آتا ہی نہیں۔ ایکس رے دکھا چکا ہوں میڈیکل رپورٹ پڑھائی ہے۔ لیکن وہ ہیں۔ کہ ان چیزوں پر ایمان لاتی ہی نہیں۔

ریاض: ان کا دھیان اور طرف لگایا کرو۔

فاروقی: (جھلاکر) میری کیا ضرورت ریاض ــــ ان کا دماغ خود ہی نئی راہیں نکال لیتا ہے۔

ریاض: ہوں۔

فاروقی: آجکل ان کے ذہن پر اک نئی سوچ مسلط ہے۔

ریاض: یعنی ــــ

فاروقی: بھئی اس دن میں مذاق میں کہہ بیٹھا۔ کہ تمھاری بے سروپا باتوں سے تنگ آچکا ہوں۔

ریاض: تو!

فاروقی: بس یہ بات بلائے جان بنا رکھی ہے۔ میں سامنے رہوں تو دل برداشتہ سی رہتی ہیں۔ سامنے نہ ہوں تو روتی رہتی ہیں۔

ریاض: اچھا۔ اچھا ــــ کل میں نے ان کی متورم آنکھوں کو دیکھ کر سوچا تھا۔ شاید نئی ٹانک راس نہیں آئی۔ میں اسے بدلنے کا سوچ رہا تھا ــــ ہوں تو بات یہ تھی۔

فاروقی: کل ساری دوپہر رو رو کر ہلکان ہوتی رہیں۔

ریاض: بُری بات ہے ــــ تمھیں ان کی دل جوئی کرنا چاہیئے۔

فاروقی: میں ان کی دل شکنی کرتا ہوں کیا؟ تم جانتے ہو ریاض ثریا میرے لیے کیا ہے۔

ریاض: ہوں۔

فاروقی: لیکن میرا تو دماغ تھک گیا ہے۔ ہر وقت مرنے کی باتیں۔ رینو کے مستقبل کی باتیں۔ حد بھی ہوتی ہے کوئی۔

ریاض: بیماری نے اندازِ فکر یاسیت کر دیا ہے ــــ کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم دل جوئی کرتے رہا کرو۔

فاروقی: ہر بات کا منفی پہلو دیکھیں گی ـــــ رینو کو لپٹا کر روتی رہیں گی۔ اس سے پوچھیں گی۔ کہ میرے مرنے کے بعد تم کیا کرو گی ـــــ کل کہہ رہی تھیں۔ ماں کی محبت کے ساتھ باپ کی محبت سے بھی محروم ہو جائیں گی رینو ـــــ پھر گھنٹہ بھر روتی رہیں ـــــ اب یہی سوچتی رہتی ہے کہ میں بدل رہا ہوں ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ ان کے بعد رینو کو بھی بھول جاؤں گا ـــــ ڈاکٹر میں بیحد پریشان ہو جاتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔

(رینو مائی کے ساتھ اندر آتی ہے۔ فاروقی سگریٹ سلگا لیتا ہے ڈاکٹر رینو کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

ریاض: مائی ـــــ رینو کی مونا کو آرام سے پلنگڑی پر ڈال دو۔

مائی: اچھا صاحب جی (جھک کر بلی کو اٹھاتی ہے)۔

ریاض: اور ہاں دیکھو ـــــ شام کو ہم اس کے لیے دوائی بھیجیں گے۔ تم خود اسے دوائی دینا۔ رینو نے اسے ہاتھ لگایا۔ تو بلی مر جائے گی۔

رینو: (جلدی سے) نہیں لگاؤں گی چچا میاں۔

فاروقی: مائی ـــــ بلی کو باہر لے جاؤ اور رینو کے ہاتھ منہ دھلا دو۔

مائی: بہت اچھا صاحب جی (باہر چل دیتی ہے۔ پیچھے پیچھے رینو بھی جاتی ہے)

فاروقی: (صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں انگڑائی لیتا ہے)

ریاض: تیمارداری کرتے کرتے کہیں خود نہ بیمار ہو جانا۔

فاروقی: لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔

ریاض: (ہوں ـــــ سوچنے لگتا ہے)

فاروقی: جب سے ثریا بیمار ہوئی ہے۔ میں گھر ہی میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ کاروبار متاثر ہو رہا ہے۔ ثریا کچھ سنبھالا لیں۔ تو کام کاج کو بھی دیکھوں لیکن ان کے واہمے میری پریشانی کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔

ریاض: (سوچتے ہوئے) ہوں۔

فاروقی: ثریا تو ثریا ـــــ رینو کی وجہ سے بھی پریشان ہوں ۔ اس کم بخت بلی کو چھوڑتی ہی نہیں ۔

ریاض: اٹھوا کر باہر پھینکوا دو اسے ۔

فاروقی: توبہ! توبہ! مجھے بچی کی جان سے ہاتھ دھونا ہیں کیا ۔

ریاض: یہ بھی سچ کہتے ہو ـــــ رینو بیٹا رو رو کر ہلکان ہو جائے ایسی صورت میں ۔

فاروقی: وہ بھی کچھ ایسی سخت جان ہے کم بخت ۔ مرتی بھی نہیں ۔

ریاض: مر گئی ـــــ تو اور مصیبت ـــــ رینو کیا کرے گی ۔

فاروقی: مر جائے تو خود ہی صبر آ جائے گا رینو کو ۔

ریاض: ہاں ٹھیک کہتے ہو ۔

فاروقی: (صبرا مسکرا کر) کہتا تو سب ٹھیک ہوں ـــــ لیکن بات بنتی کوئی بھی نہیں ۔

(ملازم چائے کی ٹرے لے کر آ جاتا ہے ـــــ دونوں باتیں کرتے ہوئے چائے پینے لگ جاتے ہیں ۔)

(ثریا کا کمرہ ــــــ برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے سامنے گدے دار کرسی پر ثریا نیم دراز ہے۔ ریشمی لباس زیب تن ہے۔ لیکن چہرے پر حسبِ معمول مردنی چھائی ہے۔ ڈاکٹر ریاض دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھا ہے۔ فاروقی مضطربانہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا ہے۔)

ثریا : (ہاتھ سے سینہ دباتے ہوئے پژمردہ آواز میں) ڈاکٹر صاحب ــــــ یہ میرا وہم نہیں ــــ جب یہاں ہاتھ لگاتی ہوں تو درد محسوس ہوتا ہے۔ اٹھ کر چلتی ہوں ــــ تو درد شدت اختیار کر جاتا ہے۔

ریاض : (مسکرا کر) بھابی! اگر آپ یہ سب وہمے دل سے نکال دیں۔ تو چند دنوں میں اپنی پہلی سی حالت پر آجائیں گی۔

ثریا : واہمے ــــ واہمے ــــ واہمے ــــ آپ نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ فاروقی بھی ہر وقت یہی سبق دہراتے رہتے ہیں۔ میری تکلیف کا احساس ہی نہیں (آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہے)

فاروقی : ہونہہ ــــ دیکھ لیا ریاض ــــ

ریاض : (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) آپ وٹامن دیتے جائیں۔ ان وسوسوں کے لیے بھی گولیاں دی ہیں میں نے ــــ فکر کی بات نہیں۔

(ثریا روتی ہے ــــ فاروقی بے چینی سے ٹہلتا ہے)

ریاض: آؤ فاروقی ـــــ (سیٹھتوسکوپ ہاتھ میں ہلاتے ہوئے) میں تمھیں دوسری گولیاں دوں گا ـــــ یقیناً بھابی کو ان سے افاقہ ہوگا۔

ثریا: (آنسو پونچھتے ہوئے) افاقہ تو اب قبر ہی میں ہوگا۔

ریاض: (جلدی سے) بھابھی ـــــ آپ تو زیادتی کر رہی ہیں۔ اتنی مایوسی۔

فاروقی: (لہجے میں جھنجھلاہٹ) میرے تو کان پک گئے ہیں ایسی باتیں سنتے ہوئے ریاض۔

ثریا: (روکر) فاروقی ـــــ

ریاض: کوئی بات نہیں ـــــ کوئی بات نہیں ـــــ چلو فاروقی میں تمھیں دوائی دیتا ہوں۔

(دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ باہر سے بلّی کی دردناک میاؤں میاؤں سنائی دیتی ہے ـــــ ثریا دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی ہے)

ـــــ ... ـــــ ... ـــــ

(فاروقی اور ڈاکٹر ریاض ثریا کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتے ہیں۔ بلّی کی کرب ناک آواز پر فاروقی کے ماتھے پر بل پڑجاتے ہیں۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر بلّی کی پلنگڑی ہے۔ رینو اس کے قریب کھڑی اسے پچکار رہی ہے۔)

فاروقی: کتنی منحوس آواز ہے کم بخت کی۔

ریاض: (ہنس کر) تم بھی وہم کرنے لگے۔

فاروقی: نہیں تو ——

ریاض: پھر آواز کو منحوس کیوں کر کہہ دیا۔

فاروقی: منحوس نہیں تو اور کیا ہے ریاض —— ثریا بھی تو سن رہی ہوگی۔ جانے کیا کیا وسوسے اس کے ذہن میں جنم لینے لگیں گے۔ مرتی بھی نہیں کم بخت یہ بلّی۔

ریاض: (ہنس کر) مار ڈالو۔

فاروقی: کیوں کر۔

ریاض: دو بوند زہر دے دو۔

فاروقی: (خوش ہو کر) یہ ٹھیک کہا تم نے ——

ریاض: ایک طرف سے تو چھٹی ملے گی تمھیں۔

فاروقی: ریاض تم میری ذہنی پریشانیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میرے ہنستے بستے گھر کو خدا جانے کس کی نظر لگ گئی۔

ریاض: (ہنس کر) پھر وہی توہم پرستی۔

فاروقی: (گہری سانس بھر کر) میری جگہ تم ہوتے تو یقیناً پاگل ہو جاتے۔

ریاض: (ہنستے ہوئے) یقیناً ـــــ یقیناً ـــــ (فاروقی کے کندھے کو تھپ تھپاتے ہوئے) حوصلہ نہیں ہارو میرے دوست ـــ عام عورتیں وہمی ہوتی ہیں۔

فاروقی: اتنی نہیں جتنی ثریا ہے۔

ریاض: بیماری سے چڑچڑی ہو گئی ہیں اور کچھ نہیں ـــــ پڑھی لکھی عورت ہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہیں۔

فاروقی: چھوڑو یار ـــــ وہمی تو وہ شروع ہی سے ہیں ـــــ (جھلائے ہوئے انداز میں) دیوار پر کوّا بول رہا ہے ـــــ مہمان آئیں گے۔ کالی بلّی راستہ کاٹ گئی۔ آفت آئے گی۔ آنکھ پھڑک رہی ہے۔ مصیبت کا سامنا ہوگا۔

ریاض: حیرت کی بات ہے۔ پڑھی لکھی خاتون اور اتنی توہم پرست۔

فاروقی: اب تو معاملہ حد سے باہر ہو گیا ہے۔

ریاض: چلو بلّی کا معاملہ تو طے کرتے ہیں۔ آج شام میں دوائی لے آؤں گا (ہنستا ہے۔) دو بوند بس کام تمام۔ صرف رینو کا فکر ہے۔

فاروقی: مری ہوئی کو دیکھے گی تو صبر آجائے گا۔ بہلا لوں گا اسے۔ اس کم بخت بلّی کی مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔ دیکھ کر کراہت آتی ہے۔ پیٹ پھول گیا ہے۔ منہ سے رال ٹپکتا رہتا ہے۔ خوفناک آوازیں نکالتی ہے۔

ریاض: ہاں بیچاری خدا جانے کتنی تکلیف میں ہے۔

فاروقی: آواز نہیں سن رہے۔ جیسے رو رہی ہے۔

(رینو دونوں کو دیکھ کر بھاگ کر ادھر آتی ہے)

رینو: چچا میاں۔

ریاض: (جھک کر اسے پیار کرتے ہوئے) کیا ہے بیٹا۔

رینو: وہ مونا ــــ مونا (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) مونا رو رہی ہے۔

ریاض: تم نے اسے ہاتھ لگایا ہوگا۔

رینو: نہیں چچا میاں۔ میں نے اسے چھوا بھی نہیں۔

ریاض: اچھا۔

فاروقی: وہ بہت بیمار ہے رینو ــــ اسے چھوڑ دو ــــ ہم تمہارے لیے اتنی موٹی ــــ سفید بلّی لائیں گے۔

ریاض: ہاں ہاں فاروقی ــــ لمبے لمبے سفید سفید بالوں والی خوبصورت بلی لا دینا ہماری بیٹی کو۔

فاروقی: ضرور ــــ ضرور لادیں گے۔

ریاض: (رینو سے) اسے باہر پھینک دیں ــــ؟

رینو: (تڑپ کر) نہیں چچا میاں ــــ میری مونا ــــ میری مونا (بھاگ کر بلّی کے پاس چلی جاتی ہے)

ریاض: بس دو بوند دینا ہی ٹھیک رہے گا۔

فاروقی: میں تو پہلے ہی کہہ چکا۔ رینو مری ہوئی بلّی کو دیکھے گی۔ تو صبر آجائے گا۔ ضد کرے گی بھی تو اور چیزوں سے بہلا لوں گا ــــ کوشش کروں گا کہیں سے دوسری بلّی مل جائے۔

ریاض: آؤ پھر ــــ دوائی کے ساتھ اس کے لیے زہر بھی لیتے آنا ــــ میرے پاس ہے ــــ

فاروقی: چلو ــــ

(دونوں چل دیتے ہیں۔)

(ثریا کا کمرہ ـــــ پلنگ کے تکیہ کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی ہے انگلی کا ناخن دانتوں سے کاٹتے سوچوں میں گم ہے۔ باہر سے فاروقی اور ریاض کی باتوں کی آواز آتی ہے۔ ثریا پہلے تو متوجہ نہیں ہوتی۔ پھر چونک جاتی ہے۔ اور کھڑکی کے قریب ہو کر سننے لگتی ہے ـــــ)

ریاض کی آواز: کیا کیا اس زہر کا؟

فاروقی کی آواز: دینے کا حوصلہ نہیں پڑا۔ شیشی جوں کی توں کتابوں کے سٹینڈ پر رکھی ہے۔

ریاض: بزدل کہیں کے ـــــ یوں لگتا ہے ـــــ ابھی تم پوری طرح تنگ نہیں آئے۔

فاروقی: تنگ، خدا کی قسم اس قدر تنگ آچکا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔

ریاض: تو پھر دو بوند دے کر ختم کیوں نہیں کر دیتے ـــــ دو بوند حلق میں گئے اور کام تمام ہوا۔

فاروقی: گناہ سے ڈرتا ہوں۔ کسی کی زندگی ختم کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ (ہنسنے کی آواز)

ریاض: گناہ اور ثواب کے چکر میں پڑ گئے۔ تو کر چکے یہ کام ـــــ اپنے آپ تو ابھی مرنے سے رہی۔

فاروقی: رینو کا بھی خیال آتا ہے۔ وہ کیا کرے گی؟

ریاض: عجیب آدمی ہو ــــ بچی ہی ہے نا ــــ روئے دھوئے گی۔ پھر خود ہی صبر آجائے گا ــــ نئی لا دینا ــــ خوش ہو جائے گی۔

فاروقی: ٹھیک! اچھا آؤ تمھیں چھوڑ آؤں ــــ اگر یہ سفا کانہ فعل انجام دونگا۔

(دونوں ہنستے ہیں ــــ ثریا کا سر چکرا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی ہے۔ آوازیں دور ہوتی جاتی ہیں ــــ ثریا بے دم ہو کر تکیے پر گر جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سر اٹھاتی ہے۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپکتی ہے)۔

ثریا: (اپنے آپ سے ــــ جیسے خواب میں باتیں کر رہی ہے) میں نے ــــ کیا سنا؟ ــــ فاروقی ــــ مجھ سے اتنا بیزار ــــ کہ زہر دے کر ــــ ختم کرنے پہ اتر آئے ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ فاروقی ایسا نہیں کر سکتا وہ مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے ــــ میں اپنے وجود سے انکار کر سکتی ہوں۔ خدا کی خدائی سے منکر ہو سکتی ہوں۔ لیکن فاروقی کی محبت میں ریاو فریب؟ یہ باور نہیں کر سکتی (سر تھام لیتی ہے) لیکن ــــ میں نے اپنے کانوں سے جو سنا ــــ اسے کیسے جھٹلا دوں ــــ سیال آگ کانوں میں ٹپکتی ہے۔ زہر ــــ دولوبند ــــ خاتمہ اُف اللہ۔ (چیختی ہے) اتنا اندھیر ــــ ایسا ظلم ــــ فاروقی یوں مجھ سے تنگ آجائے گا ــــ؟ تنگ تو آہی چکا ہے ــــ (ڈوبتی آواز میں) میں کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی ــــ فاروقی میں تبدیلی آرہی تھی۔ بات بات پہ جھلاہٹ ــــ کبھی رینو پر غصہ ــــ کبھی منحوس بلی پر ــــ میں ــــ اپنے آپ کو فریب دیتی رہی۔ دھوکے میں رکھا اپنے آپ کو ــــ ورنہ ــــ فاروقی بالکل بدل چکا ہے ــــ آہ ــــ (بستر پر گر جاتی ہے ــــ ہانپتے ہوئے) کاش مجھے موت آگئی ہوتی ــــ فاروقی ــــ فاروقی ــــ (بے اختیار ہو کر رونے لگتی ہے) ــــ روتی

ہے ـــــ پھر اک عزم سے سر اٹھاتی ہے ـــــ) ہیں ـــــ میں خود ہی تمھارے راستے سے ہٹ جاؤں گی ـــــ دو بوند زہر اپنے حلق میں خود ہی ٹپکالوں گی ـــــ (ہانپتے ہوئے) تم گناہ و ثواب کے چکر میں نہ پڑو۔ فاروقی! تم بزدل ہو ـــــ تو ـــــ میں بہادری سے یہ قربانی دے دوں گی۔ میں نے اپنی روح کی تمام تر قوتوں سے تمھیں پیار کیا ہے فاروقی ـــــ میں تمھیں خوش دیکھنے کی ہمیشہ متمنی رہی ہوں ـــــ ہیں ـــــ میں یہ زہر ـــــ اپنے حلق میں ٹپکا کر ـــــ ہمیشہ کے لیے تمھارے راستے سے ہٹ جاؤں گی ـــــ تمھارا دامن ـــــ خوشیوں سے بھر دوں گی ـــــ تم خوش رہو ـــــ تم ـــــ خوش ـــــ رہو ـــــ تم ـــــ خوش ـــــ رہو ـــــ بستر سے اٹھتی ہے ـــــ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد واپس آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں زہر کی شیشی ہے۔ ثریا کی حالت پاگلوں کی سی ہے۔ شیشی کو دیکھتے ہوئے۔ لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے پلنگ تک پہنچ جاتی ہے ـــــ)

ثریا: (شیشی دیکھتے ہوئے) دو بوند ـــــ صرف دو بوند ـــــ اور سارے دکھ درد مٹ جائیں گے ـــــ فاروقی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔

(رینو کمرے میں آتی ہے۔ لپک کر ماں کی طرف بڑھتی ہے)

رینو: امّی ـــــ امّی ـــــ جی ـــــ

ثریا: (جھپٹ کر اسے بازوؤں میں دبوچ لیتی ہے ـــــ) میری بچی ـــــ میری جان ـــــ میری روح۔

رینو: امّی ـــــ امّی ـــــ

ثریا: (اسے پلنگ پر کھینچ لیتی ہے ـــــ ثریا کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ بچی کو سینے سے لگائے دیوانہ وار پیار کرتی ہے۔ رینو گھبرا جاتی ہے)

رینو : امّی !!

ثریا : میری بچّی ـــــ (رونے لگتی ہے) میری معصوم روح۔

رینو : امّی ! آپ کیوں روتی ہیں ـــــ

ثریا : (اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے) میری بچی ـــــ تو کیا سمجھے کہ میں کیوں رو رہی ہوں ـــ تجھے ـــ کچھ پتہ نہیں ـــ تو ابھی نادان ہے ـــ لیکن جب ـــــ تو بڑی ہوگی ـــــ تو جان لے گی۔ کہ تیری بدنصیب ماں کیوں روتی تھی۔ تو کونے کھدروں میں چھپ چھپ کر رویا کرے گی میری رینو ـــــ ماں کے پیار کو ترس جائے گی۔ کوئی تیرے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں رکھے گا ـــ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں رکھے گا ـــــ زمانے کی ٹھوکریں تیرا مقدر بن جائیں گی ـــــ اندھیرے تیری زندگی کی روشنی کو نگل جائیں گے۔

رینو (رونے لگتی ہے) امّی ـــــ امّی ـــــ جی۔

ثریا : تو تنہا ہوگی ـــــ بالکل تنہا ـــــ باپ کی شفقتوں سے محروم ـــــ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ـــــ پھر تو کیا کرے گی ـــــ میری بچی۔

رینو : آپ ـــــ کیا کہہ رہی ہیں امّی ـــــ ابوّ کہاں ہیں ـــــ ؟

ثریا : ابوّ ـــــ تیرا ابوّ ـــــ درندہ ہے ـــــ سفاک ہے سنگ دل ہے۔

رینو : (کچھ نہیں سمجھ پاتی) امّی ـــــ

ثریا : وہ آدمی جو میرا نہ بن سکا ـــــ تیرا کیسے بنے گا رینو۔

رینو : جی ؟

ثریا : (زہر خند) میری باتیں تو نہیں سمجھ سکتی ـــــ نہیں سمجھ سکتی میری جان۔ تو معصوم ہے، بچی ہے ابھی ـــــ (کچھ سوچنے لگتی ہے ـــــ پھر آہستہ آہستہ شیشی اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے۔ خوفناک تاثرات چہرے سے مترشح ہیں)

رینو : (شیشی ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ کیا ہے امّی۔

ثریا : یہ؟ ـــــ یہ؟ (قہقہہ لگاتی ہے)

رینو : دوائی ہے امّی۔

ثریا : ہاں ـــــ دوائی ـــــ ہر دکھ درد سے نجات دینے والی دوائی۔ تیرے ابو کی پریشانیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی دوائی ـــــ ان کے رشتے کی ہر رکاوٹ دور کر دینے والی دوائی ـــــ (ہنستی ہے ـــــ لیکن آنکھوں میں آنسو چھلک جاتے ہیں)۔

!

رینو : امّی!

ثریا : میرے سارے روگ ختم کر دے گی یہ دوائی ـــــ (کچھ سوچ کر) میں تجھے ـــــ تجھے بھی کیوں نہ ـــــ

رینو : کیا امّی ـــــ

ثریا : زمانے کی ٹھوکریں ـــــ شفقت و محبت سے محرومی ـــــ چھپ چھپ کر رونا ـــــ نہیں نہیں رینو ـــــ میں تجھے چھوڑ کر نہیں مر سکتی ـــــ تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ساتھ ـــــ (شیشی کو دیکھتے ہوئے کانپتی آواز میں کہے جاتی ہے) ساتھ لے جاؤں گی اپنے ساتھ۔

رینو : (متعجب) کہاں امّی۔

ثریا : دور رینو۔ بہت دور ـــــ جہاں درندے نہیں بستے جہاں ابلیسانہ قوتیں بیکار ہوتی ہیں۔ جہاں ابدی سکون ملتا ہے (چیخ کر روتے ہوئے) جہاں بیویوں کو زہر دے کر چھٹکارا حاصل نہیں کیا جاتا ـــــ چلو گی نا میرے ساتھ

رینو : (ماں سے لپٹ کر) ہاں امّی۔

ثریا : (سینے سے بھینچ کر پیار کرتی ہے) شاباش میری بچّی ـــــ یہ دو بوندیں۔ حلق میں اتار کر سب مصیبتوں سے چھٹکارا پالیں گے ہم ـــــ (گود میں لٹا کر رینو کا سر بازو پر ٹکا لیتی ہے) رینو ـــــ

رینو : جی امّی۔

ثریا: منہ کھول رینو ـــــ میں یہ آبِ حیات تیرے حلق میں ٹپکا دوں ۔ اپنے ہاتھوں تجھے ختم کر ڈالوں ۔ زمانے کے سارے دکھوں سے تجھے نجات دلا دوں ـــــ کھول منہ ـــــ

رینو: میں دوائی ـــــ نہیں کھاؤں گی ـــــ (ہاتھ سے شیشی پرے ہٹاتی ہے)

ثریا: (غضب ناک اور وحشت زدہ نظر آتی ہے) کھولو منہ ـــــ کھولو ـــــ

رینو: (دانت بھینچ کر) نہیں ـــــ نہیں ـــــ (ہاتھ پاؤں مارتی ہے) ـــــ

ثریا: (دیوانگی کے عالم میں چیختے ہوئے) کھول دے منہ رینو ـــــ کھول دے ۔ جلدی کر کھول ـــــ کھول ـــــ کھو ـــــ ل ـــــ بھی ـــــ

رینو: (چیختے ہوئے) نہیں ـــــ نہ ـــــ ہیں ـــــ امّی ـــــ

(اچانک فاروقی کمرے میں آ جاتا ہے ـــــ لپک کر ثریا کی طرف آتا ہے۔)

فاروقی: یہ کیا ہو رہا ہے ـــــ ؟ ثریا ـــــ

رینو: امّی ـــــ امّی دوائی ـــــ ابو امّی دوائی (ہانپتی ہے)

فاروقی: ثریا کیا کر رہی ہو (بچی کو ثریا کے بازوؤں سے لینے کی کوشش کرتا ہے۔

ثریا: (غضب ناک ہو کر) تم ـــــ تم آ گئے ـــــ ہٹ جاؤ ـــــ چھوڑ دو رینو کو ـــــ اپنے نجس ہاتھوں سے اسے مت چھوؤ۔

فاروقی: (ششدر ہو کر) ثریا !!

ثریا: مجھے مت بلاؤ۔

فاروقی: تمھیں کیا ہو رہا ہے ۔ چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے ۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں ـــــ اور ـــــ یہ رینو کو دبوچ کیوں رکھا ہے ۔ چھوڑو بچی کو ـــــ چھوڑو ـــــ چھوڑو ـــــ

ثریا: (رینو کو بھینچتے ہوئے) ہٹ جاؤ فاروقی ۔ شعلوں کو چھیڑا تو خود جل جاؤ گی۔

فاروقی: (چیخ کر) ثریا !! کیا ہو رہا ہے تمھیں ـــــ پاگل دکھائی دے رہی ہو ـــــ (اس کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے) ہوش میں ہو یا ـــــ

(ثریا کے ہاتھ میں زہر کی شیشی دیکھ لیتا ہے۔ رنگ فق ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں۔ گھبراہٹ سے آواز بھی نہیں نکلتی بمشکل کہہ پاتا ہے "ثریا" ——)

ثریا: (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے) یہ شیشی دیکھ کر گھبرا کیوں گئے؟

فاروقی: یہ —— یہ —— کہیں رینو —— کہاں سے لی تھی شیشی —— اُف۔

ثریا: (ہنستی ہے۔ بالکل پاگلوں کی طرح) راز افشا ہو گیا ——! اوہو۔ گھبراؤ نہیں —— کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ ہم ماں بیٹی چپ چاپ تمھاری راہ سے ہٹ جائیں گی —— تمہیں قاتل کوئی نہیں کہے گا۔

فاروقی: (سر تھام کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے) کیا کہہ رہی ہو ثریا۔

ثریا: وہی جو تم سننا نہیں چاہتے —— لیکن —— میں نے تمھاری اور ریاض کی باتیں سُن لی ہیں۔ ساری سازش کا پتہ چل گیا —— یہ زہر —— دو بوندیں دے کر تم مجھے ختم کرنے کی ہمت نہ کر سکے —— میں خود رینو۔ (شیشی کھول کر رینو کی طرف لے جاتی ہے۔ جھپٹ کر فاروقی شیشی پرے پھینک دیتا ہے۔ شیشی ٹوٹ جاتی ہے۔ ہانپتے ہوئے وہ ثریا کے کندھے جھنجھوڑ ڈالتا ہے —— ثریا چیختی ہے)

فاروقی: (چیختے ہوئے) ثریا —— تم —— کتنی ظالم ہو —— (ہانپتے ہوئے) یا خدا —— میں اگر آنہ جاتا —— تو —— تو —— (بچی کو چھین کر گلے سے لگا لیتا ہے)

ثریا: تم —— تم ——

فاروقی: (بچی کو سینے سے لگائے لگائے) یہ زہر تو ریاض نے بلّی کے لیے دیا تھا ثریا —— تم —— تم کیا کرنے والی تھیں۔ (کانپتے ہوئے) میرے مولا —— اُف —— میں ذرا دیر سے آتا —— تو کیا سے کیا ہو جاتا۔

ثریا : (ہکلاتے ہوئے) زہر ـــــ بلّی ـــــ بلّی ـــــ کے ـــــ
لیے ـــــ

فاروقی : (روہانسی آواز میں) تو اور کس کے لیے تھا ثریا ـــــ تم کتنی
وہمی ہو ـــــ میں ذرا دیر سے آتا، تو یہ وہم مجھے لے ڈوبتا
ـــــ تمھاری بھول مجھے تباہ و برباد کر دیتی ـــــ آہ ـــــ میری
پیاری بچّی ـــــ (رینو کو پیار کرتا ہے والہانہ پیار ـــــ
ثریا حیرت زدہ سی ہے)۔

ثریا : (جیسے خواب سے چونک جائے) فاروقی ـــــ سچ کہہ رہے ہو ـــــ
زہر بلّی کے لیے تھا۔

فاروقی : (بچّی کو تڑپ تڑپ کر پیار کرتے ہوئے) ثریا ـــــ مجھے اتنا
ذلیل سمجھتی ہو ـــــ

ثریا : (فاروقی کی پُر سوز آواز اور رقّت بھرے لہجے سے تڑپ
کر) اُف ـــــ شکر ہے ـــــ تم ـــــ آ گئے ـــــ
ورنہ ـــــ ورنہ ـــــ اُف ـــــ میرا سر چکرا رہا ہے فاروقی۔
مجھے معاف کردو ـــــ مجھے ـــــ معاف کردو ـــــ
مجھے ـــــ معا ـــــ ف ـــــ کر ـــــ دو ـــــ فاروقی
ـــــ فا ـــــ روقی ـــــ

(ثریا تیورا جاتی ہے ـــــ فاروقی اسے بازوؤں میں
لے لیتا ہے ـــــ رینو پلنگ پر بیٹھی بے ہوش ثریا کو ایک ٹک
دیکھتی ہے ـــــ)

رینو : (ماں پر جھکتے ہوئے) ابّو، امّی کو کیا ہو رہا ہے۔

فاروقی : (گھبرائے ہوئے لہجے میں) بے ہوش ہو گئی ہیں ـــــ دوڑ کر جاؤ بیٹا
مائی سے کہو ایک گلاس پانی لے آئے ـــــ

(رینو پلنگ سے کود کر بھاگتی ہے)

فاروقی: (بے ہوش ثریا کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے اس پر جھک جاتا ہے) ثریا
—— تم کتنی خطرناک ہو —— یہیں —— ذرا —— دیر سے آتا ——
تو —— تو —— تمہاری بھول —— کتنی خوبصورت صورت اختیار
کر جاتی —— توبہ یا میرے مولا —— توبہ ——

(فاروقی ثریا پر جھکے جھکے توبہ —— اُف اللہ توبہ کہے جاتا ہے ثریا۔
گہرے گہرے سانس لیتے بے خبر پڑی ہے)

——.. .. ——

تلخیاں

(متوسط گھرانے کا ایک کمرہ ــــ ایک طرف دو پلنگ ساتھ ساتھ پڑے ہیں۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل رکھا ہے۔ داہنے ہاتھ دیوار پر کھونٹی ہے۔ جس پر خالدہ اور سلیم کے رات کے لباس ٹنگے ہیں کھڑکیوں اور دروازوں پر نئے پردے ہیں۔ پلنگ پر بھی نیا بیڈ کور ہے۔ فرش پر رنگدار دری بچھی ہے۔ دروازے کے قریب بائیں ہاتھ دو کرسیاں رکھی ہیں۔ جن پر ساٹن کے کشن ہیں۔ دیواروں پر دو ایک تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ خالدہ کی شادی کو تین چار ماہ ہی ہوئے ہیں۔ اس لیے کمرے کی ہر چیز میں نیا پن ہے خالدہ انیس بیس سالہ خوبصورت سی لڑکی ہے۔ پلنگ کی پٹی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے ــــ ریشمی دوپٹے سے بار بار آنسو پونچھ رہی ہے۔ سامنے تپائی پر ایک کھلا خط پڑا ہے۔ خالدہ خط پھر اٹھا کر پڑھنے لگتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو پھر ڈھلکنے لگتے ہیں ــــ ریشمی فیروزی دوپٹے سے وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔ سامنے دروازے سے خالدہ کی ساس اندر داخل ہوتی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کی بھاری بھر کم عورت ہے۔ خالدہ کو دیکھتے ہی گھبرا جاتی ہے۔)

ساس: (اس کے قریب بیٹھتے ہوئے) خالدہ ــــ اے بہو ــــ کیا ہوا ــــ
رو کیوں رہی ہو۔

خالدہ: (کچھ اور زیادہ رونے لگتی ہے) اماں ــــ اماں ــــ

ساس: (گھبرا کر) کیا ہوا اماں کو۔

خالدہ: (خط اس کی طرف بڑھا کر) بیمار ہیں۔

ساس: یا اللہ خیر ــــ میرا تو دل دھک سے رہ گیا ــــ کیا لکھا ہے ــــ تم
ہی سنا دو ــــ

خالدہ: (خط تپائی پر رکھ کر) اور تو کچھ نہیں لکھا ــــ صرف اتنا ہی لکھا ہے
کہ بیمار ہیں۔

ساس: نگہت کا خط ہو گا!

خالدہ: جی نہیں ــــ وہ تو دو ہفتے ہو گئے چلی گئی تھی۔ اس کا میاں لے گیا تھا۔

ساس: ہے ہے ــــ تو اب ــــ گھر میں اکیلی ہیں۔

خالدہ: (روتے ہوئے) ہمسائی کا خط ہے ــــ کوئی پاس نہیں ہو گا نا جبھی
تو گلشن کی اماں سے لکھوایا ــــ دس بارہ دن سے بیمار ہیں۔

ساس: توبہ ــــ اتنے دنوں سے بیمار اور اطلاع اب بھجوائی۔ بہو بیگم بُرا نہ
منانا ــــ تمہاری اماں تکلف بہت کرتی ہیں۔

خالدہ: (رونے لگتی ہے)

ساس: (منہ بنا کر) ایسا بھی تکلف کیا ــــ بیمار تھیں۔ اسی دن بلوا بھیجتی تھیں۔
گھر میں کوئی اور ہوتا تو بات بھی تھی ــــ ملازمہ تو ہو گی نا؟

خالدہ: (سسکیاں لیتے ہوئے) پتہ نہیں جی ــــ

ساس: (ہمدردی کا بے پناہ اظہار کرتے ہوئے) ہائے ہائے ــــ دس بارہ
دن سے بیمار ــــ تنہا ــــ اُف ــــ کیسے دن گزار رہی ہوں گی۔
(خالدہ پھر رونے لگتی ہے ــــ ملازمہ اندر آتی ہے۔ زمانہ ساز

سی عورت ہے۔ بہو کو روتے دیکھ کر سینے پر ہاتھ مارتی ہے)

ملازمہ: کیا ہوا بیگم جی —— کیوں رو رہی ہیں بہو بیگم۔

ساس: ان کی اماں بیمار ہیں۔ خط آیا ہے۔

ملازمہ: (سر پکڑ کر دری پر بیٹھتے ہوئے) یا میرے مولا —— خیر کیجیو —— بال بھی نہ دکھے میری بہو جی کی اماں کا —— کتنی اچھی عورت ہیں —— انہیں تو خدا کچھ بھی نہ کرے —— اے بی بی روتی کیوں ہو —— خدا سے دعا مانگو ماں کی زندگی مانگو ——

ساس: (پیار سے خالدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) بس بہو —— چپ کرو —— یوں تو رو رو کر ہلکان ہو جاؤ گی۔ اٹھو ہاتھ منہ دھو لو۔ اور یہ کپڑے بھی بدل ڈالو —— یوں گھبرانے سے تو کچھ نہیں ہوگا —— میرے خیال میں تو تم چلی ہی جاؤ ان کے پاس۔ سلیم دفتر سے آتا ہی ہوگا۔

ملازمہ: ہاں بیگم جی —— بیچاری اکیلی ہیں وہ —— (پھر کچھ سوچ کر) میرے تو خیال میں بیٹی سے اداس ہو گئی ہیں۔ اس بہانے بلا بھیجا ہوگا۔

ساس: (برا مان کر) لو —— تم تو اپنی ہی ہانکو گی —— بھلا ان کی بیٹی پر ہم نے کوئی پابندی لگا رکھی ہے —— جب جی چاہے جا سکتی ہے —— چار ماہ میں کتنے پھیرے لگا چکی —— ابھی تین ہفتے تو نہیں ہوئے آئے۔

ملازمہ: (خفت سے ہاتھ ملتے ہوئے) وہ تو —— بیگم جی —— میں نے بہو بیگم کا جی رکھنے کو بات کی تھی —— ورنہ —— آپ جیسی ساس ملنا تو بہو جی کی خوش قسمتی ہے۔

ساس: (خوش ہو کر) بس تو الٹی سیدھی نہ ہانکا کر —— ہاں تو خالدہ بیٹی —— تم تیاری کرو —— پانچ کی گاڑی سے چلی ہی جاؤ ——

خالدہ: (آنسو آنچل سے خشک کرتے ہوئے) وہ آلیں نا۔

ساس: وہ بھی آجائے گا —— تم تیاری تو کرو —— اٹیچی کیس میں کپڑے

رکھ لو ـــــ سلیم کا سامان بھی تیار کر لو ـــــ ضرورت ہوئی تو تم وہیں رہ جانا ہفتہ دو میں اماں ٹھیک ہو گئیں تو واپس آجانا ـــــ

خالدہ: (تشکر سے ساس کو دیکھتی ہے ـــــ)

ملازمہ: ایک لڑکی ان کی اماں کے ہاں رہتی تو تھی۔

ساس: اسے اس کا میاں لے گیا۔ اپنی اولاد تھوڑا ہی تھی۔ جوان کی تنہائی کا احساس ہوتا ـــــ

ملازمہ: ہاں بی بی اپنے خون کی تڑپ ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیکھو نا ـــــ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔

ساس: ماں جو ہوئیں ـــــ

ملازمہ: بہو بیگم کے والدین حیات ہوتے تو بیچاری بیٹی کو بیاہنے کے بعد یوں اکیلی تو نہ رہ جاتیں۔ ہائے ہا ـــــ خدا کی مرضی۔

ساس: اللہ بے نیاز ہے۔

خالدہ: (پھر رونے لگتی ہے)

ساس: بہو بیگم یہ غلط بات ہے۔ رو رو کر تم اپنی آنکھوں کا ستیاناس کر لو گی۔ (باہر سے سلیم کی آواز آتی ہے)

ملازمہ: صاحب جی آگئے۔

ساس: سلیم ہی ہے۔ چلو خالدہ بیٹی اب آنسو پونچھ لو۔ تیاری کرو جانے کی۔
(سلیم ایک خوبصورت شگفتہ مزاج نوجوان ہے۔ نئے سوٹ میں ملبوس۔ فائل کیس لیے اندر داخل ہوتا ہے۔ خالدہ کو روتے دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔)

سلیم: (ماں سے) کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہیں۔

ملازمہ: (ساس سے پہلے بول اٹھتی ہے) روئیں نہ تو اور کیا کریں۔

سلیم: (گھبرا کر) کیوں امّی!

ساس: گھبراؤ نہیں بیٹا۔ ان کی اماں کی بیماری کا خط آیا ہے۔

سلیم: (افسوس ظاہر کرتے ہوئے) اوہو ——— (فائیل کیس میز پر رکھ کر خط پڑھتا ہے) دس بارہ دن سے بیمار ہیں ——— کتنی بری بات ہے اکیلی ہیں بالکل ——— (مضطربانہ ٹہلنے لگتا ہے ———)

ساس: وہی تو میں سوچ رہی ہوں۔ کیا کرتی ہوں گی بیچاری ——— نگہت بھی تو چلی گئی ہے اور اللہ جانے ملازمہ بھی پاس ہے کہ نہیں ——— (گہری آہ بھر کر) اکلوتی اولاد بھی کسی کی نہ ہو ———

سلیم: (ماں کی طرف دیکھ کر) اب؟

ساس: اب کیا، تیاری کرو اور پانچ بجے کی گاڑی سے لے جاؤ بہو کو جب سے خط ملا ہے رو رہی ہے۔ اللہ جانے وہاں ماں کا کیا حال ہوگا۔

سلیم: (کلائی سے کوٹ قدرے کھینچ کر وقت دیکھتا ہے) ابھی وقت تو کافی ہے ——— ہم پانچ کی گاڑی پکڑ سکتے ہیں۔

ساس: ہاں ——— ساڑھے سات وہاں پہنچ جاؤ گے ——— جلدی کرو خالدہ اٹھو۔ تیاری کرو اپنے کپڑے رکھ لو اٹیچی میں۔ سلیم کے دو جوڑے بھی ڈال لو۔

سلیم: ہاں خالدہ — تم تیاری کرو۔ میں اپنی درخواست لکھ کر وزیر اعلیٰ کو دے آؤں

خالدہ: (رنگین کپڑوں والی نئی دلہن اٹھ کھڑی ہوتی ہے) کتنے دن کی چھٹی لیں گے آپ۔

ساس: (سلیم سے پہلے بول اٹھتی ہے) دو دن کی کافی ہے۔ تم کچھ دن رہ لینا۔ سلیم واپس آجائے گا۔

خالدہ: اچھا۔

(خالدہ اٹھ کر چیزیں اٹھانے رکھنے لگتی ہے ——— سلیم کرسی پر بیٹھ کر درخواست لکھنے لگتا ہے۔)

ساس: (ملازمہ سے) تم جلدی سے چائے بنا دو۔

ملازمہ: ابھی بناتی ہوں ـــــ اٹھ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔

سلیم: (خالدہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر) بس اتنی ہی ہمت ہے جناب کی ــــ خط آیا اور رو رو کر یہ حال کر لیا۔

ساس: ماں جو ہوئی ـــــ یاد نہیں پچھلے سال جب میں بیمار ہوئی تھی تو میری نجو کراچی سے ہوائی جہاز سے آئی تھی۔

سلیم: جی ہاں۔ اڑ کر پہنچتی تھیں (مسکراتا ہے)

ساس: اڑ کر ہی تو پہنچی تھی ـــــ رو رو کر ہلکان ہو گئی تھی ـــــ بیٹیوں کو ماؤں سے بڑی محبت ہوتی ہے۔

سلیم: اس کا ثبوت خالدہ خانم بھی دے رہی ہیں ـــــ حد ہو گئی ـــــ

ساس: نجو تو تڑپتی تھی میرے لیے۔

سلیم: یہ سب حوا کی بیٹیاں ایک ہی مزاج کی ہوتی ہیں۔

ساس: چل چل باتیں نہ بنا ـــــ جلدی کر ـــــ

سلیم: بہت اچھا امّی ـــــ درخواست تو میں نے لکھ لی۔ وزیر علی کو دے آؤں۔ جب تلک خالدہ کو تیار کر دیجئے (کمرے سے نکل جاتا ہے)

ساس: ہاں خالدہ ذرا جلدی کرو ـــــ لو میں تمہارا زیور بھی لے آؤں۔

خالدہ: نہیں جی ـــــ زیور کی کیا ضرورت ہے۔

ساس: نہ بہو ـــــ زیور ساتھ لے جاؤ۔ لوگ کہیں گے ـــــ مانگے کا ہوگا۔ جو تیسرے چوتھے پھیرے ہی بہو کو یوں بھیج دیا۔ چوڑیاں تو پہن رکھی ہیں۔ گلے کانوں کی چیزیں بھی پہن کر جاؤ (خالدہ سامان سنبھالنے لگتی ہے۔ ساس کمرے سے نکل جاتی ہے)

ـــــ ٭ ـــــ

(نچلے متوسط طبقے کا گھر ——— چھوٹا سا کمرہ ——— ایک طرف پرانا پلنگ ہے۔ جس پر خالدہ کی امّی پڑی ہے ——— قریب ہی ایک لکڑی کی میز پر دوائی کی شیشیاں اور گلاس وغیرہ رکھا ہے۔ ایک پرانی کرسی بھی پڑی ہے۔ جس پر بی ہمسائی بیٹھی ہے ——— کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔ بیرونی کھڑکی بند ہے۔ کونے میں دو صندوق اوپر تلے پڑے ہیں ایک کونے میں میلے کپڑے ہیں۔ بستر بھی میلا سا ہے۔ خالدہ کی امّی بڑی کمزور ہو رہی ہیں۔ کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب لگا ہے۔ اس کی دھیمی روشنی میں بخار کی حدت سے تمتمائے۔ خالدہ کی امی کے گال سرخ نظر آ رہے ہیں۔ ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہیں ——— را سے وائے کرتی ہے۔ کبھی اُف اُف کی صدائیں ہونٹوں سے نکلتی ہیں)۔

امّی: گلشن کی اماں ——— تم جا کر آرام کرو تھک چکی ہوگی۔

ہمسائی: میرا فکر نہ کرو بی بی۔

امّی: خالدہ کو خط ڈال دیا تھا ——— ہائے ——— ہائے ——— خط ڈال دیا تھا نا۔

ہمسائی: ہاں۔

امّی: کس نے لکھا تھا۔

ہمسائی: گلشن نے۔

امّی: کیا لکھا تھا ـــــ بہت زیادہ بیمار کا تو نہیں ـــــ ہائے۔ ہائے۔ نہیں لکھ دیا تھا نا ـــــ لیکن ـــــ اب ـــــ

ہمسائی: میں تو چاہتی تھی۔ خالدہ کو آنے کا لکھ دوں ـــــ تم نے ہی منع کر دیا۔

امّی: بُلا ہی لیتی اسے تو اچھا تھا ـــــ یہ بخار تو جان لے کر ہی ٹلے گا ـــــ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) پانی ـــــ اُف ـــــ جل رہی ہوں۔ پانی

ہمسائی: (اٹھ کر میز سے گلاس اٹھا کر اسے دیتی ہے) لو۔

امّی: (اٹھنے کی کوشش کرتی ہے) لاؤ ـــــ لاؤ ـــــ (سانس پھول جاتی ہے)

ہمسائی۔ لاؤ میں پلا دیتی ہوں

(بی ہمسائی اس کے سر کو ہاتھ سے سہارا دے کر اٹھاتی ہے اور گلاس اس کے لبوں سے لگا دیتی ہے)۔

امّی: (سر تکیے پر رکھتے ہوئے) بس ـــــ تیرا بھلا ہو گلشن کی اماں ـــــ خدا تجھے اس کا اجر دے، دن رات ایک کر دیا ہے ـــــ (آنسو نکل آتے ہیں آنکھیں بند کر لیتی ہے)۔

بی ہمسائی: شرمندہ کر رہی ہو بہن ـــــ ہمسائے ماں باپ جائے ہوتے ہیں یہ تو ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ تم اکیلی بخار میں پھنکتی رہو۔ اور ہم آرام سے گھر بیٹھے رہیں۔

امّی: (سر بے چینی سے ادھر اُدھر مارتے ہوئے) اللہ تیرا بھلا کرے۔ جاؤ اب سو جاؤ۔ کب تک بیٹھو گی۔

ہمسائی: میں تو آج رات تمھارے پاس ہی سوؤں گی ـــــ اتنا تیز بخار ہے۔ رات کہیں اٹھنا پڑا تو کیا کرو گی ـــــ پانی بھی تو بار بار پی رہی ہو ـــــ دوائی بھی دینا ہوتی ہے۔

امّی: (رو پڑتی ہے) خدا اکیلا بھی کسی کو نہ کرے۔

ہمسائی: (اٹھتے ہوئے) لاؤ سر دبا دوں۔

امّی: نہیں ــــ نہیں ــــ ہائے ــــ سارا بدن جل رہا ہے میرا۔ ٹھنڈا پانی دو بس ــــ

ہمسائی: اس دوائی سے بھی آرام نہیں آیا ــــ (پانی پلاتی ہے) خدا ہی اپنا فضل کرے ــــ صبح تو میں خالدہ بیٹی کو بلاوے کا خط لکھ دوں گی ــــ اے بی بی ــــ اتنی تکلیف میں ہو۔ بیٹی آگئی تو آدھی بیماری کٹ جائے گی۔

امّی: (آنسو پونچھتے ہوئے) سچ کہتی ہو ــــ لیکن ــــ کہیں اس کے سسرال والے بُرا نہ مان جائیں ــــ ابھی ــــ ابھی تھوڑے دن ہی تو ہوئے گئی ہے ــــ میری بچی ــــ خدا اسے خوش رکھے ــــ

ہمسائی: خالدہ کے سسرال والے بہت اچھے ہیں ــــ بُرا کیوں منائیں گے۔

امّی: اچھے تو ہیں واقعی ــــ میری بچی کی خوش قسمتی ہے۔ جو ایسا بَر مل گیا۔ ورنہ ــــ میں ــــ میں کس قابِل تھی ــــ (روتی ہے) شکر ہے وہ اچھے گھر میں بیاہی گئی ــــ

ہمسائی: خالدہ بیٹی واقعی بڑی خوش قسمت ہے ــــ پیسہ تو الگ چیز ہے۔ وہ لوگ بڑے مروت اور خلوص والے ہیں۔

امّی: سلیم بھی بہت اچھا ہے۔ ماں کی سی عزت کرتا ہے ــــ ہائے ہائے پانی ــــ (لبوں پر زبان پھیرتی ہے)۔

(پانی پلاتی ہے۔ باہر تانگے کی آواز آتی ہے)۔

امّی: اے گلشن کی اماں ــــ ذرا ــــ ذرا کھڑکی سے دیکھنا ــــ اُف ــــ دیکھنا لگتا ہے تانگہ رکا ہے ــــ

ہمسائی: (کھڑکی کی طرف جاتی ہے) تانگہ ہی ہے ــــ

امّی: (گھبراہٹ، خوشی اور بے چینی کے تاثرات) لگتا ہے ــــ میری خالدہ

آگئی ـــــ خط مل گیا ہو گا نا ـــــ کون ہے ـــــ گلشن کی اماں ـــــ

ہمسائی: (کھڑکی سے جھانکتے ہوئے) آں ـــــ میرا خیال ہے خالدہ ہی آئی ہے ـــــ ہاں ـــــ ہاں۔ خالدہ ہی ہے بی بی ـــــ چلو اچھا ہوا۔ ساتھ سلیم بھی ہے ـــــ

امی: (بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) ہائے ـــــ کتنا گندہ ـــــ گندہ ہو رہا ہے کمرہ ـــــ گلشن کی اماں ـــــ ذرا ـــــ وہ کونے والے کپڑے تو دوسرے کمرے میں لے جاؤ ـــــ

ہمسائی: اے ہے ـــــ اپنی بیٹی ہی ہے ـــــ کمرہ بھی صاف ہو جائے گا تم آرام سے لیٹ جاؤ۔

(امی لیٹ جاتی ہے بی ہمسائی جلدی جلدی چیزیں اٹھاتی ہے۔ کپڑے دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔ خالدہ کالے برقعے میں اندر آتی ہے برقعے کا اوپر والا حصہ گلے ہی میں لٹک رہا ہے ـــــ تیر کی سی تیزی سے ماں کی طرف آتی ہے۔ اور امی کہہ کر ماں سے لپٹ جاتی ہے۔ دونوں رونے لگتی ہیں ـــــ)

ہمسائی: بس بیٹی ـــــ اچھا کیا تم آگئیں ـــــ تمہاری اماں تو سخت گھبرا رہی تھیں۔

خالدہ: (سر اٹھا کر ماں کو دیکھتی ہے۔ پھر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگتی ہے) اماں ـــــ میری اماں۔

(سلیم اٹیچی کیس ہاتھ میں لیے اندر آتا ہے)

سلیم: السلام علیکم۔ (اٹیچی زمین پر رکھ کر پلنگ کی طرف جاتا ہے)۔

بی ہمسائی: وعلیکم السلام ـــــ جیتے رہو بیٹا ـــــ اچھا ہی کیا خالدہ کو لے آئے ـــــ بیچاری ـــــ

(سلیم ماں کے قریب جھک جاتا ہے ـــــ خالدہ کی امی اس کے

سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیتی ہے۔ ب ہمسائی کرسی پلنگ کے قریب کر دیتی ہے ــــ)

ہمسائی : بیٹھو بیٹا ــــ خالدہ بیٹی بس اب حوصلہ کرو ــــ تم آگئی ہو۔ تو تمھاری اماں ٹھیک ہو جائیں گی ــــ

سلیم : بڑے افسوس کی بات ہے خالہ جان ــــ آپ اتنی تکلیف میں تھیں اور ہمیں اطلاع ہی نہ بھیجی ــــ امی بھی شاکی تھیں کہ آپ ہمیں غیر سمجھتی ہیں ــــ

امّی : اللہ تمھیں زندگی دے بیٹا ــــ تمھیں غیر سمجھوں گی ــــ تو اپنا کون ہو گا۔ ہائے سوچا تھا ــــ بخار ہے اتر ہی جائے گا ــــ لیکن یہ کم بخت تو اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا ــــ

خالدہ : (ماں کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری اماں ــــ میری پیاری اماں ــــ اتنی بیمار اور اکیلی ــــ (رونے لگتی ہے)

امّی : اکیلی تو نہ تھی بیٹی ــــ گلشن کی اماں بیچاری دن رات دیکھ بھال کرتی رہی ہے ــــ میں تو ان کا احسان نہیں اتار سکتی ــــ

ہمسائی : پھر وہی بات ــــ ہمسائے آخر کس لیے ہوتے ہیں۔

خالدہ : (تشکرانہ اسے دیکھتی ہے) خالہ جی ــــ آپ کتنی اچھی ہیں ــــ آپ بھی اماں کی دیکھ بھال نہ کرتیں تو جانے میری اماں کا کیا حال ہوتا ــــ

سلیم : میرا تو خیال ہے خالدہ ــــ خالہ جان کو ہم اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔

امّی : جیتے رہو بیٹا ــــ خدا تمھاری عمر دراز کرے۔

ہمسائی : یہ تو بہت ہی اچھا کرو گے بیٹا ــــ یہاں اکیلے ــــ

امّی : (بات کاٹ کر) نہیں گلشن کی اماں ــــ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ بخار اتر جائے تو پھر کیا ہے ــــ تکلیفیں آتی ہی رہتی ہیں۔

سلیم : (جھک کر ان کے قریب ہوتے ہوئے) افسوس کی بات ہے خالہ جان کیا میں آپ کا بیٹا نہیں۔

امّی : (گلوگیر آواز میں) بیٹا ہی تو ہے۔

سلیم : پھر آپ کو کیا اعتراض کیوں ہے۔ بیٹے کو خدمت کا موقع ملنا چاہیئے۔

خالدہ : لیکن ــــــ !

سلیم : (پیار سے) تم چپ رہو جی ــــــ یہ ماں بیٹے کا معاملہ ہے۔

(خالدہ مسکرانے لگتی ہے)

سلیم : خالہ جان میں آپ کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گا ــــــ یہاں اکیلے پڑے رہنا ظلم ہے ــــــ

امّی : (آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہے)

سلیم : بس خالدہ ــــــ فیصلہ ہو گیا ــــــ خالہ جان ہمارے ساتھ چلیں گی۔

امّی : بیٹا ــــــ سنو ــــــ تو ــــــ

سلیم : نہیں ــــــ میں کچھ نہیں سننے کا ــــــ میری چھٹی سات دن کی ہے ــــــ آٹھویں دن ہم سب اپنے گھر ہوں گے ــــــ میری ماں میرے پاس رہ سکتی ہیں تو آپ کیوں نہیں رہ سکتیں۔ اللہ کا فضل ہے خالہ جان آپ کے آجانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا ــــــ خوشی اور تسکین کا احساس ضرور ہو گا ــــــ

(امی آنسو بھری آنکھوں سے دعائیں دیتی ہے۔ خالدہ خوش نظر آنے لگتی ہے)

(سلیم کے گھر کا ایک صاف ستھرا کمرہ ـــــ سفید بے داغ بستر پر خالدہ کی امّی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ قریب ہی میز پر سفید رومال پڑا ہے ـــــ ترتیب سے دوائی کی شیشیاں پڑی ہیں۔ ایک پلیٹ میں موسمی پھل رکھا ہے ـــــ سامنے کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک پر سلیم بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ دوسری پر اس کی امّی بیٹھی سبزی بنا رہی ہیں۔ خالدہ ماں کے قریب بیٹھی اسے چائے پلا رہی ہے ـــــ)

خالدہ : (محبت سے) امّاں ـــ اب تو آپ بالکل صحت مند لگ رہی ہیں۔

سلیم : (اخبار ایک طرف رکھ کر) واقعی ـــــ خالہ جان اب آپ بستر چھوڑ دیں (ہنس کر) دیکھا کیسا جادو ہے ہمارے پاس ـــ آپ تو یہاں آنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔

خالدہ کی امّی : اللہ تمھیں زندگی دے بیٹا۔

سلیم کی امّی : خواہ مخواہ تکلف کرتی تھیں ـــــ اکیلے میں تو بیماری دوگنی ہوگئی تھی ـــــ اچھا کیا تھا ـــ بیٹے انہیں اپنے ساتھ ہی لے آئے۔ دنوں میں ٹھیک ہوگئیں۔

خالدہ کی امّی : یہ سب آپ کے خلوص اور محبت کا اثر ہے بہن ـــــ میں عمر بھر آپ کا احسان نہ اتار سکوں گی۔

سلیم : لیجیے ـــــ یہ احسان ہوگیا۔ خالہ جان آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے ـــــ میں آپ کا بیٹا نہیں کیا؟

(سلیم کی امیّ کو کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ ماتھے پر ناگواری کے اثرات ہیں۔ لیکن بہت جلد اپنی ذہنی کیفیت پر قابو پا لیتی ہے۔)

سلیم کی امیّ : سچ کہہ رہا ہے سلیم ـــــ یہ بھی آپ کا گھر ہے۔ ہفتہ بھر اور یہاں رہیں۔ تو کوئی پہچان ہی نہ سکے گا۔ کہ اتنی بیماری کاٹی ہے۔

سلیم : ہفتہ بھر کیوں ـــــ؟ امیّ اب ہم انہیں یہیں رکھیں گے ـــــ وہاں اکیلی کیا کریں گی۔

سلیم کی امیّ : (ہکلاتے ہوئے) ہاں ـــــ ہا ـــــ ں ـــــ کیا ہرج ہے

خالدہ کی امی : (اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) نہیں بہن ـــــ میں تو اب سوچ رہی ہوں۔ واپس جانے ـــــ

خالدہ : (بیقرار ہو کر) اماں ـــــ ابھی سے واپس جانے کا بھی سوچنے لگیں۔ ابھی تو آپ اچھی طرح چل پھر بھی نہیں سکتیں۔

سلیم : ان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے خالدی ـــــ ہم انہیں جانے تھوڑا ہی دیں گے۔

خالدہ کی امیّ : (مسکراتے ہوئے) بس اتنا ہی کافی ہوتا ہے بیٹا ـــــ

سلیم : کیوں؟ مجھے تو آپ کی منطق سمجھ نہیں آئی ـــــ لیکن اب آپ یہاں سے جا نہیں سکتیں۔ کیا فرق پڑ جائے گا۔ جہاں گھر میں میری امیّ ہیں ـــ دو بھائی ہیں، ایک پھوپھی ہیں۔ وہاں آپ ہوں گی۔ تو کیا فرق پڑے گا۔

خالدہ : سلیم ٹھیک کہتے ہیں امیّ ـــــ (چائے کی پیالی میز پر رکھ کر ماں کے گھٹنوں پر کمبل ڈال دیتی ہے ـــــ)

سلیم : دوائی ابھی بند نہیں کرنا خالدہ ـــــ دے رہی ہو نا وقت پر۔

خالدہ : جی۔

سلیم : خوراک کا بھی پورا خیال رکھنا۔ خالہ جان کنجوسی پر نہ اتر آئیں۔ پھل اور دودھ
خاص طور پر دینا ہیں۔

خالدہ : جی دے رہی ہوں (سلیم گھڑی پر وقت دیکھ کر" مجھے ذرا کام سے جانا
ہے" کہہ کر کمرے سے نکل جاتا ہے)

(سلیم کی اماں کے چہرے پر کچھ ناگواری کے سائے پھر لہرا نسے
ہیں۔ سبزی کا تھال اٹھا کر باہر جانے لگتی ہے۔ خالدہ بڑھ کر تھال
پکڑنا چاہتی ہے)۔

خالدہ: لایئے میں مائی کو باورچی خانے میں دے آؤں۔

سلیم کی امی: (ٹھنڈے لہجے میں) میں خود ہی لے جاتی ہوں۔ تم ماں کی خدمت کرو۔

(خالدہ ششدر سی دیکھتی رہ جاتی ہے ـــــ ساس کے لہجے کی
چبھن اسے بری طرح کھٹکتی ہے۔ لیکن ماں کے خیال سے چہرے پر
شگفتگی کے آثار لے آتی ہے)

خالدہ : اماں اب آپ لیٹ جایئں۔ لایئے ذرا ٹانگیں دبا دوں۔

امی : نہیں بیٹی میں اب بالکل ٹھیک ہوں ـــــ تم جا کر اپنی ساس کا ہاتھ
بٹاؤ۔ دوپہر کا کھانا تیار کر لو۔

خالدہ : وہ تو روز میں ہی کرتی ہوں۔ امی ـــــ مائی تو اوپر کا کام کرتی ہے۔

امی : (کچھ سوچتے ہوئے) خالدہ بیٹی ـــــ اب میں بالکل تندرست ہوں
سوچتی ہوں واپس ہی چلی جاؤں ـــــ کب تک یہاں رہوں گی۔

خالدہ: سلیم کہتے ہیں آپ اب یہاں ہی رہیں گی۔

امی : یہ تو اس کی سعادت مندی ہے بیٹی ـــــ

خالدہ: ہرج بھی کیا ہے اماں ـــــ سلیم کی ماں اس کے گھر میں رہ سکتی ہے
تو خالدہ کی ماں کیوں یہاں نہیں رہ سکتی۔

امی: پگلی ـــــ

خالدہ: پگلی نہ پگلی —— آپ کو ہم کبھی جانے نہیں دیں گے۔ وہاں اکیلی رہ کر کیا کریں گی ——

امیؔ: وہ میرا اپنا گھر ہے بیٹی۔

خالدہ: اور یہ آپ کی بیٹی کا گھر ہے۔

امیؔ: (مایوس آواز میں) ہر چیز کا اپنا ٹھکانہ ہوتا ہے بیٹی —— ہر فرد اپنے مقام پر ہی بھلا لگتا ہے۔

خالدہ: (ماں کی ٹانگیں دباتے ہوئے) آپ تو جانے کیسی باتیں کرتی ہیں۔

امیؔ: اپنے تجربے کی ——

خالدہ: بس رہنے دیجئے تجربہ —— آپ خواہ کچھ کہیں ہم آپ کو جانے تھوڑا ہی دیں گے۔

(باہر سے خالدہ کی ساس کی آواز آتی ہے وہ مائی پر برس رہی ہے)

آواز: —— اے کہاں مر گئی —— مائی —— اے مائی —— کہاں دفعان ہو گئی۔ سارا کام اسی طرح پڑا ہے —— میں ہی رہ گئی ہوں کام کرنے کو —— جہنم میں جائے سب کچھ ڈبڑ بڑانے کی مسلسل آواز آتی ہے ——)

امیؔ: خالدہ بیٹی جاؤ —— دیکھو تو باہر جا کر —— مائی کہاں گئی ہے —— جو کام ہے تو کرلو ——

خالدہ: پتہ نہیں امی جی کو کیا ہوتا جا رہا ہے —— باورچی خانے کا کام سارا سنبھال کر آئی ہوں۔ خدا جانے کونسا کام ہے۔ جس کے لیے اس قدر بگڑ رہی ہیں۔

امیؔ: جا کر دیکھ ہی لے نا —— کھانا بھی تو پکانا ہے۔

خالدہ: مجھے پتہ ہے اماں ــــــ روز میں ہی پکاتی ہوں نا ــــــ ابھی کافی وقت ہے۔

امیّ: مائی شاید ابھی تک نہیں آئی۔ جا پتہ تو کر ــــــ

خالدہ: (اماں کے پلنگ سے اٹھتے ہوئے دوپٹہ درست کرتے بڑبڑاتی ہے) خدا جانے روز بروز امی جی کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کھنچی کھنچی رہتی ہیں۔ یوں جیسے کوئی غیر ہوں ــــــ

امیّ: اپنی اپنی عادت ہی ہے نا ــــــ

خالدہ: ان کی عادت اب بگڑتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے تو پیار اور محبت سے ہر کام کا کہتی تھیں۔ اب سرے سے مجھے تو کچھ کہتی نہیں۔ مائی کے بہانے مجھے سناتی رہتی ہیں۔

امیّ: خالدہ ــــــ ایسی باتیں نہ کرو۔

خالدہ: سچ کہہ رہی ہوں اماں ــــــ امیّ جی میں بڑی تبدیلی آرہی ہے۔ شاید اب ساس بننے پہ اُتر آئی ہیں۔

امیّ: تو اپنے کام سے کام رکھا کر بیٹی۔ بڑے چار باتیں کر بھی لیں تو درگزر کرنا چاہئیں۔

خالدہ: وہ تو کرتی ہی ہوں اماں ــــــ لیکن پتہ نہیں، انہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔

(باہر سے پھر آواز آتی ہے)

آواز: کہاں دفع ہو گئی تھی ــــــ تجھے بھی کچھ احساس نہیں ہوتا۔ میں بوڑھی جان کو کہاں کہاں گھسیٹتی پھروں ــــــ گھر میں کسی کو ذمہ داری کا احساس ہی نہیں ــــــ تجھے بھی پر لگنے لگے ہیں ــــــ بھلے کا زمانہ ہی نہیں رہا ــــــ ذرا منہ لگاؤ تو سر پر چڑھ کر ناچنے لگتے ہیں لوگ ــــــ ہونہہ ــــــ گھر والے بیگانے اور بیگانے گھر والے ــــــ ہونہہ ــــــ

(خالدہ اماں کو اور اماں خالدہ کو دیکھنے لگتی ہیں ــــــ)

خالدہ: (جل کر) دیکھا اماں ـــــ کیسی باتیں کرتی ہیں امّی جی ـــــ؟

امّی: (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) یہ سب مجھے سنا رہی ہیں بیٹی ۔ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہونا چاہیئے ۔ اب میں تندرست ہوں ۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیئے ۔

خالدہ: یہ کیا بات ہوئی ـــــ آپ ہر بات کو اپنی ذات سے منسوب نہ کر لیا کریں ۔

(امّی آہ بھر کر آنکھیں پونچھنے لگتی ہے)

(ساس کا کمرہ ——— سادہ سے پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا ہے خالدہ کی ساس ایک گاؤ تکیہ کے سہارے بستر پر بیٹھی ہے۔ دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہے۔ لیکن چہرے پر ناخوش گواری کے آثار ہیں۔ کمرے کی کھڑکیاں، دروازے کھلے ہیں ——— دو ایک کرسیاں، ایک میز اور دایٔں ہاتھ دیوار کے ساتھ اوپر تلے بکس رکھے ہیں۔ ملازمہ بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی ہے ——— مالکن کا رخ دیکھ کر خوشامدی لہجے میں باتیں کر رہی ہے)

ساس: اے کون آیا تھا ابھی ———

مائی: سلیم صاحب تھے جی ——— بیگم جی ———

ساس: اچھا ——— آج چھٹی ہے نا اسے۔ بازار گیا تھا۔ کچھ لے کر آیا۔

مائی: (زار داری کے لہجے میں ہاتھوں سے اشارہ کر کے ———) دو لفافے۔ اتنے بڑے بڑے ——— جانو مالٹے اور سیب تھے ——— لے کر سیدھا ان کے کمرے میں گئے ———

ساس: (جل کر) ہونھ ——— ان کے سوا نظر ہی نہیں آتا کوئی ——— (منہ بنا کر) اٹھا لایا تھا ——— بیماری کی پوٹ کو ——— اب خدمت ختم ہی نہیں ہو رہی۔ ہونھ ——— وہ بھی کیا جم کر بیٹھ گئی ہے۔ واپس جانے کا تو نام ہی نہیں لیتی۔

مائی: (شبہ پاکر) واپس؟ توبہ کریں بیگم جی۔ جیسے اچھے سے اچھا کھانے کو ملے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے واپس جانے ــــ بہو بیگم تو دیوانی ہوئی جاتی ہیں ماں کے لیے ــــ زبردستی کھلاتی ہیں۔

ساس: مفت کا مال ہے نا ــــ ساری عمر نصیب نہ ہوا ہوگا ــــ پھل، دودھ انڈے، مکھن، یخنی ــــ مہینہ بھر ہو گیا بخار ٹوٹے ــــ غذا ابھی تک کھائی جا رہی ہے۔

مائی: (آنکھیں مٹکا کر) آپ کو کیا بتاؤں بیگم جی ــــ گھی کی چوریاں کھلائی جا رہی ہیں ماں کو۔

ساس: گھی؟ ڈاکٹر نے گھی تو اسے منع کیا ہے۔

مائی: پر میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ بہو بیگم گھی میں گوندھ گوندھ کر روٹی پکاتی ہیں۔ ماں کے لیے۔

ساس: جبھی گھی کا ٹین دسویں دن ختم ہو جاتا ہے۔

مائی: (چالاکی سے) بیگم جی ــــ ہم غریب لوگ ہیں ــــ مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے۔ کہیں میرا نام نہ لگ جائے۔ روز حلوے بنیں۔ پراٹھے پکیں۔ گھی تو ختم ہوگا ہی ــــ میں نے آپ کو خبردار کر دیا ہے۔ ــــ بیگم جی کہیں میرا نام نہ لگ جائے۔ کہ گھی میں گھر لے جاتی ہوں۔

ساس: اے ہے۔ تو تو پاگل ہے بالکل ــــ اچھا ــــ آئندہ نظر رکھا کر کیا کیا پکتا ہے ماں کے لیے ــــ سمجھیں ــــ بتا دیا کر مجھے۔

مائی: (دباتے دباتے اِدھر اُدھر متوحش نظروں سے دیکھتی ہے) بیگم جی۔ آپ کو کیا کیا بتاؤں ــــ ہم ٹھہرے نوکر لوگ ــــ لگائی بجھائی کریں تو۔ بری بات ہے ــــ ورنہ میں نے ماں بیٹی کی باتیں اپنے کانوں سنی ہیں؟

ساس: (جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ جاتی ہے) کیا؟

مائی: چھوڑیئے بیگم جی ــــ میرا تو دل بُرا ہوا تھا۔ آپ کا بھی بُرا ہوگا۔

ساس : اے ہے کچھ بکے گی بھی۔

مائی : بہو جی سے کچھ کہیئے گا نہیں۔

ساس : اتنا ہی ڈر ہے اس کا تجھے۔ میرے ہوتے وہ کون ہوتی ہے۔ تجھے کچھ کہنے والی۔

مائی : (چالاکی سے) پھر بھی بیگم جی ــــ ہم غریب لوگ ہیں۔ روٹی کا آسرا آپ آپ کے دم سے بنا ہے ــــ ایسا نہ ہو بہو جی مجھے بھی نکلوا دیں۔

ساس : کچھ بتائے گی بھی اب ــــ یا بکتی چلی جائے گی ــــ تیری یہی باتیں تو مجھے ناپسند ہیں۔ کیا سنی تھیں باتیں ــــ

مائی : ماں بیٹی آپ کے خلاف بہت زہر اگل رہی تھیں۔

ساس : (بھڑک اٹھتی ہے) میرے خلاف ــــ کیا تیر مارا میں نے انہیں۔ آنکھیں بند کیے گزارہ کر رہی ہوں ــــ تو یہ سر پر ہی چڑھنے لگیں۔

مائی : (چالبازی سے) اے بیگم جی ــــ معافی دے دو مجھے ــــ میں نے کہا تھا نا۔ میرا دل بُرا ہوا آپ بھی نہ سنیں ــــ

ساس : لیکن! ہونہہ ــــ انہیں جرأت کیسے ہوئی۔ میرے خلاف باتیں کرنے کی۔ اپنی اوقات بھول گئی ہیں ــــ میں تو کوستی ہوں اس وقت کو جب لڑکی دیکھ کر ریجھ گئی تھی ــــ بیٹی کے ساتھ ماں بھی سر پر آن بیٹھی ہے ــــ میرے بیٹے کو تو ہتھیا ہی لیا ہے دونوں جادوگرنیوں نے۔

مائی : بالکل بیگم جی ــــ (ناک پر انگلی رکھ کر) ساس سے ہمدردی سہی۔ لیکن ایسے وطیرے بھی ہم نے کہیں نہیں دیکھے۔ صاحب جی تو آپ سے زیادہ ان کا خیال رکھتے ہیں۔

ساس : (تلملاتی ہوئی پھنکارتی ہے) ہونہہ ــــ

مائی : حکم اختیار تو سب بہو جی کا چلنے لگا ہے۔ کیا مجال جو صاحب جی ان

کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں۔

ساس: (دانت پیس کر) بیٹا میرا اور خدمت کرے خالدہ کی ماں کی۔

مائی: آپ کے پاس تو گھڑی دو گھڑی بیٹھیں گے ——— ساس کے کمرے میں ہی نظر آتے ہیں ہر وقت ——— خالدہ بی بی بھی تو آگے پیچھے جھکتی پھرتی ہیں۔ میں کبھی آپ کی طرف داری کی بات کر بھی دوں تو بس ڈانٹ کر رکھ دیتی ہیں بیگم جی ——— میں نے تو آپ کا ہی نمک کھایا ہے ——— (روتے کی آواز بنا کر) آپ کی برائی کیسے سن سکتی ہوں۔

ساس: (تلملاتے ہوئے) ہوں ——— سیدھا کر لیتی ہوں سب کو۔

مائی: (ہاتھ جوڑ کر) بیگم جی ——— میرا نام نہ لیجئے گا۔

ساس: (جھلا کر) تجھے اپنی ہی پڑی ہے۔

مائی: غریب ہوں۔ ڈرتی ہوں بیگم جی۔

ساس: (رازداری سے) ٹوہ میں رہا کر ذرا ——— کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔ مجھ تک بھی تو پہنچتی رہیں۔

مائی: بہت اچھا بیگم جی ——— ہم تو آپ ہی کا دیا کھاتے ہیں۔

ساس: (لیٹ جاتی ہے) چل داب میرے پاؤں ———

مائی: (پاؤں دبانے لگتی ہے)

ساس: سن۔

مائی: جی۔

ساس: باورچی خانے کا کام بہو کو کرنے دیا کر۔ اب دلہن بن کر ہی بیٹھی رہے گی۔

مائی : اچھا ــــ اچھا جی ــــ (زور زور سے دبانے لگتی ہے)

ساس : اور ہر بات سے خبردار بھی کیا کر مجھے ــــ

مائی : (آگے پیچھے ہوتے ہوئے) بہت اچھا بیگم جی ــــ بہت اچھا۔

(ساس کبھی ادھر کبھی ادھر پہلو بدلتی ہے۔ ساتھ ساتھ بڑبڑ بھی کیے جاتی ہے۔)

(خالدہ کی ساس کا کمرہ ــــ پلنگ پر صاف ستھرا بستر ہے۔ سر پر پٹی باندھے ساس آہستہ آہستہ ہائے ہائے کر رہی ہے ــــ میز پر چائے کی خالی پیالی رکھی ہے۔ چابیوں کا گچھا اس کے تکیے کے قریب پڑا ہے۔ ملازمہ اس کے پیچھے بیٹھی کمر دبا رہی ہے ــــ)

مائی : بیگم صاحب جی، اسپرو کی ٹکیہ کھالی آپ نے۔

ساس : نہیں ــــ تو کمر دباتی جا ــــ ٹکیہ سے آرام تھوڑا ہی آئے گا۔

مائی : اسپرو کی ٹکیہ تو جادو کی گول ہوتی ہے بیگم جی ــــ ادھر نگلی ادھر درد غائب کھا لیتیں تو اچھا ہی تھا ــــ بہو بیگم نے کہا تھا، چائے کے ساتھ لے لیں۔

ساس : خود آ کر نہ دے سکتی تھی۔

مائی : جی ــــ جی ــــ وہ تو آپ جانتی ہی ہیں نا ــــ ماں ہوتی تو دوڑی آتیں (آنکھیں گھما کر) حالانکہ میں نے بتایا ہی تھا۔ بیگم جی کے سر میں سخت درد ہے۔

ساس : اب تو مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی ــــ گھر والے غیر ہو گئے غیر گھر والے بن بیٹھے ــــ

مائی : اب تو اچھی بھلی ہیں بہو کی اماں ــــ کیا چہرہ نکھر آیا ہے۔

ساس: بہانہ خوب گھڑتی ہیں۔ یہاں جم جانے کا ــــ (نقل اتارتے ہوئے)
میں تو چلی جاتی ــــ سلیم کی محبت اور اصرار قدم روک لیتی ہے۔
ہونھ ــــ سلیم ــــ ایک آدھ بار کہہ کیا بیٹھا ــــ بات ہی پکڑ
لی ہے اس نے۔

مائی: بیگم جی ــــ آپ تو سمجھ دار ہیں ہی ــــ بھلا گھر میں ایسا عیش بیسر
آتا ہوگا؟ سچ پوچھیں تو مجھے صاحب جی پر بھی غصہ آتا ہے۔ اتنی بھی
مسرت کا ہے کی ــــ داماد ہو کر بچھے جاتے ہیں ــــ ذرا رعب داب
تو ہونا چاہیئے نا ــــ

ساس: سب سمجھتی ہوں ــــ (آہ بھر کر) سر تو سلیم نے ہی چڑھایا ہے
ماں بیٹیوں کو ــــ

مائی: آپ بھی تو صاحب جی سے کچھ نہیں کہتیں۔

ساس: کیا کہوں۔

مائی: اے ہے بیگم جی ــــ چلے بہانے انسان سنا ہی دیتا ہے نا ــــ
آپ نے تو ایک ہی چپ سادھ رکھی ہے ــــ کڑھ کڑھ کر اپنا خون
جلاتی ہیں ــــ آج سر میں درد ہے۔ کل خدانخواستہ کوئی اور بیماری
ہلہ بول دے گی۔ فکر تو جان کی دشمن ہوئی ہے بیگم جی۔

ساس: (آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتی ہے) ہوں۔

مائی: صاحب جی کو بلاؤں۔

ساس: (نفی میں سر ہلا دیتی ہے۔ باہر سے قدموں کی آواز آتی ہے۔ سلیم دروازے
سے داخل ہوتا ہے)

مائی: لو وہ خود ہی آ گئے (رٹائی ہمدردی سے مالکن کا سر دبانے لگتی ہے ــــ)

سلیم: (جلدی سے پلنگ کے قریب آ کر ماں پر جھکتے ہوئے) کیا ہوا امی ــــ؟
طبیعت خراب ہے۔ سر درد ہو رہا ہے۔

(ماں چپ چاپ آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ہے ــــ ٹھنڈے ٹھنڈے گہرے گہرے سانس لینے لگتی ہے)

مائی : صبح سے یہ وقت آگیا ــــ سر درد ٹھیک ہی نہیں ہو رہا۔

سلیم : کیوں امیّ ــــ؟ صبح سے تکلیف ہے۔ آپ نے بتایا ہی نہیں۔

ساس : (آواز میں نقاہت پیدا کر کے) کسے بتاتی بیٹا ــــ

سلیم : خالدہ سے کہا ہوتا ــــ اسپرو دے دیتی۔ فوراً آرام آجاتا۔

ساس : (طنزیہ انداز میں) ہونھ (سلیم حیران ہو کر ماں کا منہ دیکھتا ہے۔)

مائی : دُلہن بیگم مصروف تھیں ــــ (آواز میں لگائی بجھائی کی آگ ہے)

سلیم : ایسی کون سی مصروفیت ہے۔ کہ اسپرو کی ٹکیہ بھی نہ دی جا سکتی۔ تم نے خالدہ سے کہا تھا۔ کہ امیّ کو تکلیف ہے۔

ساس : کہنے کی کیا ضرورت ہے بیٹا ــــ سر درد رہی ہے نا ٹھیک ہو جائے گا۔

سلیم : عجیب بات ہے ــــ اتنی شدت کا درد اور صبح سے یوں ہی پڑی ہیں۔

ساس : اور کیا کرتی بیٹا ــــ (گہری سانس لے کر) انسان بوڑھا ہو جائے تو بے کار ہو جاتا ہے ــــ

سلیم : امیّ۔

مائی : آپ کے دم قدم سے تو اس گھر میں رونق برکت ہے بیگم صاحب جی ــــ خدا نہ کرے جو آپ بیکار ہوں ــــ آپ کو اللہ سلامت رکھے۔

ساس : ہائے ــــ اُف ــــ ذرا زور سے دبا سر کو ــــ ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ باتیں کیے جائے گی بس ــــ

سلیم : (مائی سے) جاؤ خالدہ سے اسپرو اور ایک گرم پیالی دودھ لے کر آؤ۔

ساس : چھوڑو بیٹا ــــ (مائی سے) بیٹھ تو میرا سر دبا۔

سلیم : (حیرانگی سے) امیّ ــــ کیا بات ہے ــــ اسپرو کھا لینے میں کیا ہرج ہے۔

مائی: (ہمدردی جتاتے ہوئے) صاحب جی ——— صاف بات کہوں۔ بیگم جی کو سر درد سے زیادہ اس بات کا دکھ ہے۔ کہ صبح سے تڑپ رہی ہیں۔ بہو بیگم نے اگر پوچھا نہ ان کی اماں نے ———

(سلیم جیسے چکرا سا جاتا ہے ——— اس کا موڈ بگڑنے لگتا ہے۔ ماں گوشۂ چشم سے اس کو دیکھتی ہے ——— پھر گردن موڑ کر مائی کو مصنوعی غصے سے دیکھتی ہے)

ساس: تو بک بک کرتی ہی جائے گی ——— تجھے کس نے کہا وکالت کرنے کو بہو بیگم فارغ تھوڑی ہے ———

(سلیم سر جھکا کر سوچنے لگتا ہے ——— ماں تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھ کر چہرہ اور پژمردہ بنا لیتی ہے)

مائی: آپ نے تو ایک ہی چپ سادھ رکھی ہے ——— ہم سے تو نہیں دیکھا جاتا یہ سب کچھ ———

ساس: (آنکھیں بند کر لیتی ہے) گزارہ کرنا ہوتا ہے۔ تو کیا چاہتی ہے۔ ہر بات اچھال کر گھر میں تماشہ کھڑا کر دوں ——— چل اب چپ رہ ——— خبردار جو تو نے کوئی بات کی ———

مائی: (آنکھیں مٹکا مٹکا کر) آپ کا دل گردہ ہی ہے ——— جو سب کچھ برداشت کیے جا رہی ہیں ——— کوئی اور ہوتا تو ———

سلیم: (مائی کو جھڑک کر) تمھیں اتنی زبان کھولنے کی جرأت ہو گئی ——— گھر کے معاملے میں تیرے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

(مائی خفگی کے انداز میں نظریں گھماتی ہے ——— مالکن کو دیکھتی ہے پھر زور زور سے دبانا شروع کر دیتی ہے۔ سلیم گم صم سا نظر آتا ہے۔ پھر اٹھ کر باہر چلا جاتا ہے۔ ماں اور مائی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہیں ———)

مائی : بیگم صاحب جی ـــــ آنکھیں کھُل گئی ہیں ۔صاحب جی کی ـــــ

ساس: چپ ہو گیا تھا ـــــ کہیں کوئی جھگڑا ہی نہ کھڑا نہ کر دے ـــــ کم بخت تو نے خواہ مخواہ جھوٹ بولا ـــــ خالدہ صبح تو مجھے پوچھنے آئی تھی۔ اس کی اماں بھی دوبارا آئی ـــــ شام مہمان آ رہے ہیں ۔ان کا کھانا بھی تو دونوں ماں بیٹی پکا رہی ہیں ـــــ

مائی : سب ایسے ہی چلتا ہے بیگم جی ـــــ صاحب جی کو کان تو ہو گئے ـــــ اپنی ماں کو بھول ہی گئے تھے جیسے ـــــ صبح و شام ساس کی خدمت ہی میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے ـــــ

ساس: بات تو تو نے اس کے کان میں ڈال دی ـــــ دلہن پر بگڑے گا ضرور۔ کہیں معاملہ بڑھ ہی نہ جائے ـــــ

مائی : آپ فکر نہ کریں جی ۔سب سمیٹ لوں گی ـــــ سارے راہ جانتی ہوں میں ـــــ ہوں ـــــ

ساس: وہ تو مجھے پتہ ہی ہے ـــــ چل دبا سر کو ـــــ ہاں ذرا آہستہ آہستہ ـــــ

(باورچی خانہ ــــ دائیں ہاتھ تیل کا چولہا رکھا ہے ۔ بائیں ہاتھ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں ۔ کارنس پر کچھ برتن ہیں ۔ الماری میں مختلف قسم کے ڈبے پڑے ہیں ۔ خالدہ چولہے کے قریب بیٹھی ہے ۔ دونوں چولہوں پر دیگچیاں چڑھی ہیں ــــ لگن میں سبزی کاٹ کر رکھی ہوئی ہے ۔ ایک تھال میں چاول ہیں ۔ دو تین دیگچیاں سامنے پڑی ہیں ۔ چہرہ تمتما رہا ہے ۔ دوپٹہ کارنس پر لٹک رہا ہے ۔ شلوار کے پائنچے چڑھائے کام میں مصروف ہیں خالدہ کی اماں نل کے نیچے برتن اکٹھے کر رہی ہے ۔ وہ برتن دھونے لگتی ہے ــــ)

خالدہ : اماں کیا کر رہی ہیں ؟

امی : یہ برتن دھو ڈالوں ــــ بہت سے جمع ہو گئے ہیں ۔

خالدہ : وہ مائی کس مرض کی دوا ہے ــــ آپ نے تو آہستہ آہستہ اس کے سارے کام اپنے ہی ذمے ڈال لئے ہیں ۔

امی : میں بھی تو بیکار بیٹھے تنگ آجاتی ہوں ۔

خالدہ : یہ کیا بات ہوئی ــــ آپ نے تو حد ہی کر دی (غصے سے) چھوڑیں برتن دھوے گی آکر ــــ میں اسے بلاتی ہوں ــــ وہ تو بہانے بناتی ہی رہتی ہے ۔

امی : تمہاری ساس کا سر دبا رہی ہے ــــ میں دھو ڈالتی ہوں ۔ بیٹی وقت ہی کتنا لگے گا ۔ کام ابھی اور بھی تو بہت ہیں ۔

خالدہ : بس آپ رہنے دیں برتن ــــ دھوتی پھرے گی وہ ــــ وہ تو جان

چراتی ہی پھرتی ہے ـــــ بس بہانہ ہے سر دبانے کا ـــــ اتنا احساس ہی نہیں اسے کہ آج کام زیادہ ہے ۔ امی جی بھی تو اسے کچھ نہیں کہتیں ۔ سر چڑھ گئی ہے بہت ـــــ میرا کہا تو سنتی ہی نہیں ۔

امی : تو جانے دے بیٹی ـــــ خواہ مخواہ اس کے منہ نہ لگا کر ـــــ لگائی بجھائی کی بڑی عادت ہے اسے ـــــ بڑی خرانٹ عورت ہے ۔

خالدہ : مجھے تو ذرا اچھی نہیں لگتی ـــــ ملازمہ ہو کر حکم چلاتی ہے مجھ پر ـــــ کھانے کے لئے تو پوچھا ہی نہیں کبھی خود ہی نکال لیتی ہے ۔

امی : چیزیں بھی خوب اڑاتی ہے ۔ گھی کا پیالہ بھر کر کئی دفعہ لے گئی ۔ میں تو چپ ہی رہتی ہوں ۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں ۔

خالدہ : ہائے اماں ـــــ آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا ۔ اس دن امی جی مجھے خاص طور پر سنا رہی تھیں ۔ کہ گھی کا ڈبہ دس دن میں ختم ۔ اندھیر ہے ۔ میں کچھ سمجھی نہ تھی ان کی بات ـــــ چینی بھی اتنی جلدی ختم ہو گئی اس دفعہ ۔ میرا تو خیال ہے دودھ بھی پی جاتی ہے ۔ اڑھائی سیر دودھ روز آ رہا ہے ۔ ایک گلاس آپ کو دیتی ہوں ۔ ایک امی جی کو ۔ بس باقی چائے پر ہی ختم ہو جاتا ہے ۔

امّی : منہ چڑھی ہے نا مالکن کی ـــــ تم کچھ نہ کہو ۔ پرانی ملازمہ ہے ان کی ۔

خالدہ : لیکن یہ بھی تو بری بات ہے نا اماں ۔ امی جی سمجھتی ہوں گی کہ میں نے ہی کھلے ہاتھوں خرچ شروع کر دیا ہے ۔ گھی واقعی اب کے بہت جلد ختم ہو گیا ۔ صرف دو دفعہ سلیم کے لئے حلوہ ہی فالتو بنایا ہے ـــــ ورنہ وہی روز کا خرچ ہے ۔

امّی : برتن دھونے لگتی ہے ، تماشا دیکھے جائیں ۔ کوئی موقعہ ہوا تو بات کر لیں گے ۔

خالدہ : جب گھی پیالہ بھر کر نکالتی ہے تو آپ پوچھتی نہیں ۔

امّی : ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگی ۔ ہمسایوں کا دینا ہے ۔

خالدہ : توبہ ! کب کبھی ہم نے مانگا ہے کسی سے ـــــ

امی : مجھے کیا خبر تھی۔
خالدہ : اب دھیان ہی رکھئے گا امی۔
(اماں برتن دھونے لگتی ہے —— خالدہ کبھی ایک دیگچی میں کبھی دوسری میں چمچ چلاتی ہے —— سلیم باورچی خانے کے دروازے میں نظر آتا ہے۔ وہ کچھ کھنچا کھنچا سا دکھائی دے رہا ہے)۔
خالدہ : (مسکرا کر دیکھتے ہوئے) صبح سے یہ وقت آگیا ابھی تک فارغ نہیں ہوئی توبہ خدایا —— چھ آدمیوں کا کھانا پکانا کتنا مشکل ہے۔ دعوت دینا بھی آج کل کون سا آسان کام ہے۔
سلیم : خالدہ —— امی کے سر میں درد ہے (لہجہ تلخ سا ہے۔ خالدہ اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے)
خالدہ : میں نے چائے اور اسپرو بھجوادی تھی۔
سلیم : بھجوا کر فرض ختم ہو گیا تمہارا —— جا کر دیکھ نہ سکیں امی کو۔ تڑپ رہی ہیں درد سے۔
خالدہ : جی!
سلیم : تمہیں میری ماں کا کچھ تو احساس ہونا چاہئیے ——
خالدہ : میں —— میں صبح گئی تھی ان کے کمرے میں ——
سلیم : گئی تھی —— گئی تھی —— اس کا کیا مطلب —— اتنا نہ ہو سکا۔ ذرا ان کا سر ہی دبا دیتیں۔ اتنی سی بات سے خوش ہو جاتیں وہ ——
خالدہ : لیکن صبح سے تو میں یہاں مصروف ہوں —— کتنا کام ہے دیکھیں تو سہی ——
سلیم : میں کچھ نہیں جانتا —— (سلیم واپس مڑتے ہوئے بولا) مجھے تمہارے رویے سے کوفت ہوئی ہے —— تمہیں خود بھی احساس ہونا چاہئیے۔ میری ماں کا بھی کوئی حق ہے۔

(بڑبڑ کرتا وہ واپس ہو جاتا ہے۔ اماں کے ہاتھ کام کرتے رک جاتے ہیں۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں۔ خالدہ خاصی پریشان ہو جاتی ہے۔)

خالدہ : (سوچتے ہوئے) انہیں کیا ہوا ہے اماں ——

امی : خدا جانے ——

خالدہ : امی کو صبح میں خود دیکھ کر آئی —— اچھی بھلی تھیں —— سر درد تھا۔ اسپرو اور چائے بھجوا دی تھی۔

امی : میں بھی گئی تھی۔ باتیں کر رہی تھی مائی سے۔

خالدہ : بیٹے کو خدا جانے کیا کہا —— خاصے بگڑے نظر آ رہے تھے سلیم۔

امی : (سر تشویش سے ہلاتی ہے) کچھ بگڑی بگڑی رہتی ہیں۔ تمہاری ساس۔

خالدہ : میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں اماں ——

امی : میری وجہ سے یہ سب کچھ ہے۔

خالدہ : توبہ —— آپ تو خواہ مخواہ میں رہنے سے منسوب کر لیا کریں۔

امی : تو نہیں جانتی بیٹی —— میرے تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ مجھے واپس جانے ہی دو —— مجھے بہت محسوس ہوتا ہے۔ ابھی تو عزت سے چلو جاؤں گی یہ نہ ہو گھر والے منہ کھول کر جواب دے دیں۔

خالدہ : (چڑ جاتی ہے) نہیں جانے دوں گی —— نہیں جانے دوں گی —— اماں یہ میرا گھر ہے —— اور اس گھر پر آپ کا بھی حق ہے —— کوئی اور ہوتا تو جانے بھی دیتی آپ کو —— (روہانسی ہو کر) ابو ہی زندہ ہوتے۔ تو کیا پڑی تھی آپ کو یہاں آنے کی —— لیکن اب —— اکیلی جان ہے آپ کی —— یہاں رہنے سے کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کیا کھا لیتی ہیں آپ —— ہونھ —— سارا کام کرتی رہتی ہیں —— ملازموں کی طرح —— پھر بھی —— منہ سیدھا نہیں ہوتا ان کا ——

امی : (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) جوش میں آنے کی ضرورت نہیں بیٹی —— تمہیں کہا ہے نا، ہر چیز کا اپنا ٹھکانا ہوتا ہے۔ دستور ہیں زمانے کے۔ بیٹی کے گھر پڑا رہنا بے عزتی ہے۔

خالدہ : آپ اس رنگ میں نہ سوچیں امی —— آپ کی مجبوری بھی تو ہے۔

امی : ہے تو سہی —— لیکن ——

خالدہ : خدا جانے آپ کی عمر ابھی کتنی پڑی ہے —— روز بروز کمزوری کی ہی جانب بڑھ رہی ہیں نا —— میں آپ کی بیٹی ہوں —— آپ کو سنبھالنا میرا فرض اماں —— آپ کا کوئی بیٹا نہیں، بھائی نہیں، شوہر نہیں —— کون دیکھ بھال کرے گا آپ کی ——

(امی گہری سانس چھوڑتے ہوئے برتن دھونے لگتی ہے۔ خالدہ دیگچی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے) -

—— ⁂ ——

(خالد کا کمرہ —— ماں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے کے انداز میں کمرے میں لاتی ہے۔ اور پھر اسے پلنگ پر بٹھا دیتی ہے۔ غصے سے چہرہ سرخ ہو رہا ہے —— اماں کے ہاتھ گیلے ہو رہے ہیں۔ کپڑے بھی کچھ تر ہیں۔ دوپٹے کے آنچل سے ہاتھ پونچھتی ہے ——)

خالدہ : (غصے سے) نوکرانی مرگئی تھی۔ جو آپ ڈھیر کپڑوں کا دھونے بیٹھ گئیں۔ ابھی تو پوری طرح آپ کی کمزوری بھی رفع نہیں ہوئی —— ظلم خدا کا آپ نے تو اپنے آپ کو اتنا گرا دیا ہے۔ نوکرانیوں کی طرح کام میں جتی رہتی ہو —— اتنے کپڑے دھونے کی ہمت ہے آپ میں۔

امی : (افسردگی سے) اپنا کرتہ دوپٹہ دھونے لگی تھی —— سلیم کی اماں ڈھیر کپڑوں کا اٹھا لائی۔ اب کیا جواب دیتی میں —— کیسے دیتی —— بیٹی —— تم ہی بتاؤ —— گھر کی فضا پہلے ہی کیا کم خراب ہو رہی ہے جواب دیتی تو جانے کتنا بڑا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ——

خالدہ : ہو جاتا تو ہونے دیتیں —— (پھنکارتی ہے) آپ کو تو نوکرانی سمجھتی ہیں جیسے۔

امی : (افسردگی سے) ان کے در پر جو پڑی ہوں خالدہ بیٹی —— اب تو سلیم بھی کھنچا کھنچا رہنے لگا ہے۔ کئی بار تو مجھ سے جھڑپ ہو چکی —— تو تو نادان ہے

سمجھتی ہی نہیں ـــــ یہاں رہنے سے کونسا آرام مل رہا ہے مجھے۔ مفت کی ذہنی کوفت ہی ہے۔ دنیا کی ریت یہی ہے ـــــ

خالدہ: جہنم میں گئی دنیا اور دنیا کی ریت ـــــ

امی: (زہر خند) تو بچی ہے ابھی ـــــ نہیں سمجھ سکتی ـــــ یہ معاملے نازک ہوتے ہیں۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں چلی جاؤں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

خالدہ: امی آپ کا بار کس پر ہے ـــــ؟ کتنا ہے آپ کا بار ـــــ سونے کا نوالہ تو نہیں نگلتیں۔ الٹے دستور بنے ہیں۔ لکیر کے فقیر بنے رہیں تو ٹھیک ہے ـــــ

امی: چل چپ ہو جا ـــــ ابھی سلیم کے آنے کا وقت ہے۔ بات کا بتنگڑ بن جائے گا پھر۔

خالدہ: بنتا ہے تو بنا کرے ـــــ آج سلیم آلیں ـــــ میں خود ان سے کھل کر ساری بات کروں گی ـــــ میری اماں کی بے عزتی کروانے لے آئے تھے یہاں ـــــ (آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں)

(کمر پر ہاتھ رکھے ـــــ ماتھے پر شکنیں ڈالے، ساس دروازے سے اندر آ جاتی ہے۔ سخت طنزیہ لہجے میں بولتی ہے۔ اس کا انداز لڑنے کا ہے ـــــ خالدہ دیکھ کر رہ جاتی ہے۔ اماں گھبرا جاتی ہے)

ساس: کیا کہے گی کھل کر سلیم سے ـــــ میں بھی تو سنوں ـــــ کونسا تیر مارا ہے اس نے ـــــ لگائی بجھائی کرے خاوند سے ـــــ جادوگرنی تو ہے ہی ـــــ ہتھیا تو لیا ہے میرے بیٹے کو ـــــ

اماں: (اٹھ کر اس کے قریب آتی ہے) بہن آپ ناحق ناراض ہو رہی ہیں ـــــ

ساس: (ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتے ہوئے) حق پر تو بیٹی ہے۔ میں تم دونوں کی نیت اچھی طرح جانتی ہوں ـــــ گھر پر قبضہ جما کر مجھے نکالنا چاہتی ہو۔

خالدہ: امی جی ـــــ آپ سوچ کر بات کیا کریں۔

ساس: ہاں ہاں ـــــ یہی کہلوانا ہے نا تجھ سے ـــــ بات کرنا مجھے آتی

ہی کہاں ہے —— کوئی اور ساس ہوتی تو دن میں تارے دکھا دیتی۔
خالدہ : (رونے لگتی ہے)
ساس : رو رو کر سچی ہو جا —— ماں بیٹی کو یہ کام خوب آتا ہے۔
اماں : نہیں۔
ساس : چپ رہو جی —— تمہیں اسی دن کے لئے یہاں بلایا تھا۔ حکم، حکمرانی، تمہاری ہو گئی —— مجھے تو بے کار سمجھ کر الگ کر کے رکھ دیا۔
اماں : اے بہن! تمہارا گھر تمہیں مبارک —— میں تو لاکھ بار خالدہ سے کہہ چکی —— کہ مجھے واپس جانے دے۔
ساس : دو کپڑے کیا دھونے کو دیئے قیامت کھڑی ہو گئی۔
خالدہ : دو کپڑے؟ آپ کو خیال نہ آیا۔ کہ اماں ابھی کمزور ہیں۔ مائی کس مرض کی دوا ہے —— کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی —— آپ نے اسے اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔
ساس : وہ میری ملازمہ ہے —— جیسے میں کہوں گی ویسے کرے گی۔ ہاں ——
خالدہ : اتنا منہ لگاتیں ہیں آپ اسے —— اسی لئے تو چوری بھی کرنے لگی ہے۔ گھی —— چینی —— دودھ ——
ساس : ہاں ہاں۔ لگا لے اس پر الزام —— یہی تو کرے گی تو اب —— کھلا پیا دیا اماں کو —— نام دھر دیا نوکرانی کا ——
خالدہ : (زور سے) امی جی ——
ساس : میں اندھی تو نہیں —— سب کچھ دیکھتی ہوں —— تو یہ نہ سمجھ، کہ میں کچھ جانتی نہیں —— اب لگی اوپر سے رعب ڈالنے —— ہونہہ۔ بیماری کے بہانے۔ ——
خالدہ : خدا کا خوف کھائیں امی جی۔
امی : (رونے لگتی ہے) خالدہ چپ ہو جا تو —— ابھی سلیم آ جائے گا۔ بات خواہ مخواہ بڑھ جائے گی ——
خالدہ : (رو کر) اماں —— اتنا بڑا الزام —— چوری نوکرانی کرے اور نام آپ

کا نگے ـــــ سلیم آتے ہیں تو ساری بات کھل جانا چاہیئے۔

ساس: (ہاتھ ہلا ہلا کر) رو دھو کر سچی ہو جائے گی۔ مارے جوتے میرے سر پہ۔ حکم حکمرانی تو تیری ہی ہے ـــــ (باہر سے سلیم کی آواز آتی ہے۔ ساس زور زور سے روہانسی آواز میں کہتی ہے) میں تو جنم جلی زندہ رہ گئی ناحق ـــــ وہ مر گئے تھے ـــــ میں بھی مر جاتی ـــــ بہو کی ٹھوکریں کھانے کو زندہ رہ گئی ـــــ زور زور سے رونے لگتی ہے۔ آنسو نہیں ہیں لیکن دوپٹے سے برابر پونچھ رہی ہے۔ خالدہ اور اماں ہراساں ہو کر اسے دیکھنے لگتی ہے ـــــ سلیم کے اندر آنے کی صدا ـــــ آتی ہے)

ساس: آگیا ہے سلیم ـــــ سکھا پڑھا لے اسے ـــــ نکال دو مجھے گھر سے۔

خالدہ: امی جی ـــــ آپ کو ہو کیا رہا ہے ـــــ کیا کہہ دیا ہے میں نے۔ بات خواہ مخواہ بڑھائے جا رہی ہیں ـــــ میں اتنے دنوں سے آپ کا رویہ دیکھ کر بھی چپ تھی۔ لیکن آج ـــــ آج ـــــ

ساس: آج مار میرے سر میں جوتا ـــــ بیٹے سے بھی بے عزتی کروالے۔ ماں سے بھی ـــــ ہائے ـــــ اس زندگی سے تو مجھے موت آجائے۔ (سلیم اندر آتا ہے ماں رونے لگتی ہے ـــــ)

سلیم: (غصے میں بھر کر) کیا ہوا۔ آج پھر وہی بک بک ـــــ

خالدہ: پہلے بات تو سن لیجئے ـــــ

ساس: جھوٹی تو میں ہی ہوں ـــــ تم ماں بیٹی تو سچی ہو ـــــ بیٹا ـــــ تو کچھ نہ کہہ انہیں ـــــ برا بھلا مجھے ہی کہہ ڈال ـــــ کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا ان کا۔

امی: نہیں بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی ـــــ معاملہ بڑھا دیا تم نے۔

ساس: (بیٹے کی طرف دیکھ کر) دیکھ لے ـــــ اسی لئے تو میں کچھ بولتی نہیں تھی ـــــ جانتی تھی ـــــ جھوٹا مجھے ہی کریں گی۔ (رونے لگتی ہے) اپنے سر پہ ہاتھ رکھ بین کے انداز میں) میں تو مر ہی جاؤں تو اچھا ہے ـــــ مجھے تو یہاں سے کہیں بھیج دے بیٹا ـــــ ماں جائے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔ نہیں

. تو نجو بیٹا ہی کے پاس بھیج دو ـــــ
خالدہ : آپ نجو بیٹا کے پاس جا سکتی ہیں ، لیکن خالدہ کی ماں یہاں ـــــ
سلیم : (بات کاٹ کر غصے سے) تمہاری زبان بہت دراز ہو گئی ہے خالدہ ۔ میرے سامنے اس گستاخی سے کلام کر رہی ہو میری ماں سے ۔
ساس : ہائے ہائے ـــــ تو نے دیکھا ہی کیا ہے ـــــ بیٹی تو بیٹی ، ماں بھی جینے نہیں دیتی ۔
سلیم : (اماں سے) آپ کو کچھ تو احساس ہونا چاہیئے ـــــ میں آپ سے کس طرح پیش آتا ہوں ۔ اور آپ ـــــ
امی : بیٹا ـــــ
خالدہ : آپ تو ـــــ
سلیم : چپ رہو تم ـــــ گھر کیا ہے جہنم بن گیا ہے ـــــ میں پر سکون ماحول چاہتا ہوں ـــــ ایسی بک بک کا میں عادی نہیں ہوں ـــــ سمجھیں ـــــ (پیر پٹختا کمرے سے نکل جاتا ہے ـــــ ساس بھی فاتحانہ انداز میں خالدہ کو دیکھ کر کمرے سے نکل جاتی ہے ۔ خالدہ اماں کے گلے سے لپٹ جاتی ہے ـــــ دونوں رونے لگتی ہیں ـــــ)
خالدہ : تم واپس چلی جاؤ اماں ـــــ تم واپس چلی جاؤ ـــــ سارا عتاب تمہاری وجہ سے ہے اماں ـــــ تم واپس چلی جاؤ ۔
امی : میں تو پہلے ہی یہ کہتی تھی میری بچی ـــــ (دونوں روتی ہیں)

ـــــ ٭ ـــــ

(خالدہ کا کمرہ ـــــ اماں کا سامان بندھا پڑا ہے۔ ایک سوٹ کیس ایک گٹھڑی ـــــ خالدہ پلنگ پر بیٹھی رو رہی ہے ۔ اماں دل گرفتہ ہے۔ سلیم خاموش کھڑا ہے ـــــ اماں اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتی ہے)

اماں : میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھولوں گی بیٹا ـــــ

(سلیم نادم نادم سا نظر آتا ہے)

(مائی اندر آتی ہے ـــــ)

مائی ـــــ تانگہ آ گیا ہو بیگم۔

(اماں حسرت سے ادھر ادھر دیکھتی ہے ـــــ خالدہ اٹھ کر ماں کے گلے سے لپٹ کر رونے لگتی ہے ۔ اماں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلتے ہیں ـــــ بیٹی کے سر کو چومتے ہوئے روتی آنکھوں سے دعائیں دیتی ہے)

اماں : خدا تجھے ہمیشہ آباد رکھے بیٹی ـــــ میرے یہاں رہنے سے جو تلخیاں پیدا ہوئیں ۔ انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا ـــــ میں نہ کہتی تھی۔ ہر چیز کا اپنا ٹھکانا ہوتا ہے ۔ ہر فرد اپنے مقام پر ہی بھلا لگتا ہے ـــــ

خالدہ : (روتے ہوئے) اماں ـــــ اماں۔

اماں : (سلیم سے) میری بچی کی خطائیں درگزر کرنا بیٹے ـــــ تم نے خلوص اور محبت سے مجبور کیا تھا ورنہ ـــــ میں ـــــ اپنا مقام جانتی ہوں ـــــ اب

یہی دعا کرنا ـــــ مجھے بیماری نہ آئے ـــــ موت آجائے ـــــ

خالدہ : (تڑپ کر) اماں ـــــ اماں ـــــ میری اماں!

(سلیم نادم ہو کر سر جھکا لیتا ہے ۔ مائی سامان اٹھا کر
لے جاتی ہے)

(ماں بیٹی گلے لگ کر روتی ہیں)

ـــــ ❀ ـــــ

بوجھ

(متوسط طبقے کا ڈرائنگ روم ـــــ سیما اپنے بھائی اور بھابی کے ہمراہ بیٹھی ہے بھائی کے ہاتھ میں خط ہے ۔ جسے ایک بار پڑھنے کے بعد اب دوسری دفعہ پڑھ رہا ہے ۔ سیما اداس اور پریشان ہے آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں ۔ بھابی کچھ بیزار سی نظر آتی ہے ۔ لیکن زمانہ سازی ہے ۔ ـــــ شوہر کے سامنے متفکر نظر آنے کی کوشش کرتی ہے)

بھائی : (خط میز پر ڈال کر) اف اتنا ظلم ـــــ راشد انسان نہیں درندہ ہے ۔

سیما : (رو دیتی ہے) ہائے میری رخشی باجی ۔

بھائی : حد ہو گئی ـــــ مہینے بھر کی بچی گود میں ـــــ بیماری بھی اور پٹائی بھی ۔

سیما : نہ جانے کس حال میں ہے میری باجی ـــــ خط میں لکھا ہے مہینہ بھر سے بخار آ رہا ہے ۔

بھابی : آپ لوگ تو خواہ مخواہ متفکر ہو رہے ہیں ۔ خط رخشی کا تو ہے نہیں ۔ جانے کسی نے شرارت سے لکھ دیا ہے ۔ خدا نہ کرے جو وہ ایسی دکھی ہو ۔ راشد اتنا برا بھی تو نہیں ۔

سیما : (آنسو پونچھ کر) بھابھی ـــــ خط باجی کی ہمسائی کا ہے ۔ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی ۔ باجی ضرور بیمار ہیں اور راشد بھائی ـــــ آواز گھٹ جاتی ہے)

بھابی : بھئی سوچنے کی بات ہے ۔ مہینے بھر سے رخشی بیمار ہوتی ۔ تو ہمیں اطلاع نہ دیتی ——

سیما : میں باجی کی عادت سے واقف ہوں بھابی —— وہ سارے دکھ اپنی جان پر جھیل جاتی ہے ۔

بھابی : تم تو خواہ مخواہ وہم کر رہی ہو —— رخشی کی شادی کو چوتھا سال جا رہا ہے ۔ کبھی اس نے کوئی شکایت کی ہے ؟ خوش باش آتی ہے خوش باش چلی جاتی ہے ۔

بھائی : تم نہیں سمجھتی شکیلہ —— رخشی بڑی صابر لڑکی ہے ۔ راشد کے متعلق مجھے بہت کچھ پتہ چلا ہے ۔ وہ آوارہ اور بدقماش آدمی ہے ۔ چار سال سے رخشی اس سے نباہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے ۔ رخشی یہاں آتی ہے ۔ ہنستی مسکراتی ہے ۔ لیکن میں نے اس کی ہنسی میں ہمیشہ غم کی ٹھنڈک محسوس کی ہے ۔ اس کی مسکراہٹ میں دکھ کا دباؤ اتنا واضح ہوتا ہے ۔ کہ چھپائے نہیں چھپ سکتا ۔ (سیما رونے لگتی ہے) میں جانتا ہوں ۔ اس کی زندگی مسلسل عذاب ہے ۔

بھابی : (بیزاری سے) ہائے بیچاری رخشی ۔

سیما : اندر ہی اندر گھلتی رہیں ۔ کمزور تو پہلے ہی اتنی ہو رہی تھیں ۔ اس پر بخار بھی آنے لگا ہے ۔ ہائے اللہ میری باجی روتی ہے) بھائی جان —— رخشی باجی کا کیا ہو گا ؟

بھائی : (ملائمت سے) نہ رو سیما —— میں رخشی کو یہاں لے آؤں گا —— (بھابی کے چہرے پر بیزاری کے واضح آثار نظر آتے ہیں) رخشی بے سہارا نہیں ہے ۔ جو جبر واستبداد کے پنجے میں دبوچنے کو چھوڑ دی جائے ۔ اس کا بھائی زندہ ہے ——

سیما : ماں باپ کے بعد ہمیں آپ ہی کا سہارا ہے ۔ بھائی جان (ہچکیاں)

بھابی : پگلی روتی کیوں ہے —— بڑا بھائی باپ ہی تو ہوتا ہے —— تم دونوں بھی مجھے کوکو اور جمی کی طرح عزیز ہو ۔

سیما : بھائی جان !

بھائی : میں آج رات ہی کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ نہ جانے بے چاری رخشی کس حال میں ہے۔ اوہ —— میری بدنصیب بہن ——

بھابی : (جلدی سے) ہاں ہاں جا کر اس کا پتہ تو کرنا چاہیئے —— خدا کرے کہ یہ خط جھوٹ ہی ہو۔ اور رخشی اپنے گھر اچھی بھلی ہو۔

سیما : (سر نفی میں ہلا کر) خط جھوٹ نہیں ہے بھابی —— رخشی باجی کی یہ ہمسائی جس نے خط لکھا ہے۔ بڑی ہی نیک اور خدا ترس عورت ہے۔

بھائی : (خط اٹھا کر بلند آواز سے پڑھتا ہے) رخشی کو مہینے بھر سے بخار آ رہا ہے صبح سے شام تک کولہو کی طرح کام میں جتی رہتی ہے۔ اس پر بھی بس نہیں۔ ہر وقت کی پھٹکار گالی گلوچ —— اب تو چند دنوں سے راشد مار پیٹ پر بھی اتر آیا ہے۔ ظالم نے کل اس قدر پٹائی کی —— کہ ——

سیما : (روتے ہوئے) بس کیجئے بھائی جان بس —— میرا تو کلیجہ پھٹنے لگا ہے۔

بھائی : شکیلہ تم بیگ میں میرے رات کے کپڑے ڈال دو۔ میں آج رات کی گاڑی ہی سے رخشی کو لینے جانا چاہتا ہوں۔

بھابی : ہائے ہائے آپ تو اتنے برہم ہو رہے ہیں۔ صبر و ضبط سے کام لینا چاہیئے رخشی بال بچوں والی ہے۔ آخر تو اسے وہیں رہنا ہے۔ آپ راشد کو سمجھانے کی کوشش کیجئے گا۔

بھائی : وہ نہیں سمجھنے کا شکیلہ —— سمجھانے کی نوبت ایک دو بار نہیں کئی بار آئی —— لیکن اس نے ہمیشہ الٹا اثر لیا —— اب پانی سر سے ہی گزر گیا ہے کم بخت کہاں سے پلے پڑ گیا —— میں نے اس رشتے کی مخالفت بھی کی —— لیکن اماں۔ خدا بخشے انہیں، کسی کی سنتی کب تھیں۔ مالدار لڑکا دیکھا۔ اس کے کردار کے متعلق سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

بھابی : قسمت کا لکھا ہو کے رہتا ہے۔ ماں باپ اولاد کے دشمن تو نہیں ہوتے

اچھا ہی سوچتے ہیں۔

: رخشی کے بارے میں تو اچھا نہ سوچا ——— اتنی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کو آوارہ اور بدچلن کے پلے باندھ دیا۔ کوئی تیز طرار لڑکی ہوتی۔ تو شاید اس قماش کے آدمی کو ناکوں چنے چبواتی ——— رخشی تو چپ چاپ جل جانے والی ہے۔ میں اس کی عادت کو اچھی طرح جانتا ہوں شکیلہ ——— کسی کو دکھ دینے کا تو وہ سوچنے کی بھی روادار نہیں۔

سیما : گلہ شکوہ تو کرنے کی عادت ہی نہیں ———

بھائی : میں جانتا ہوں ——— وہ شروع ہی سے گم گو اور بے ضرر سی ہے۔ مجھے یاد ہے میں ہمیشہ اس پر رعب جمایا کرتا تھا۔ زیادتی کیا کرتا تھا۔ لیکن اس نے اس بات کی کبھی اماں سے شکایت کی تھی نہ ابا سے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میری زیادتی پر بھی اسے بڑا ناز ہے۔ بڑا گھمنڈ ہے۔ بڑا فخر ہے۔ اپنے ہاتھوں میرے کام کیا کرتی تھی۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور اندھیری راتوں میں وہ بارہ بارہ بجے تک جاگا کرتی تھی۔ میں دودھ پی کر سونے کا عادی تھا۔ وہ ہمیشہ دودھ گرم کر کے مجھے دیا کرتی۔ اکثر یوں ہوتا کہ پڑھتے پڑھتے اونگھ آجاتی ——— وہ چپ چاپ میرے سرہانے بیٹھی رہتی۔ جب بیدار ہوتا تو دودھ گرم کر کے لاتی ——— کتنا پیار تھا اسے مجھ سے ——— ابا کی مالی حالت ان دنوں کچھ اچھی نہ تھی۔ میری خاطر رخشی نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی ——— ابا ہم دونوں کے تعلیمی بوجھ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ کتنی بڑی قربانی ہے ——— مجھے بھی تو اس کے بغیر چین نہ آتا تھا ——— تمہیں یاد ہوگا۔ شکیلہ۔ اس کی شادی کے بعد میں کتنی مدت اس کے لئے بے چین رہا ———؟

شکیلہ : جی یاد ہے۔

بھائی : (گھڑی دیکھ کر) سیما ذرا ٹائم ٹیبل تو لانا۔

سیما : اچھا بھائی جان (اٹھ کر جاتی ہے)

بھائی : تم میرا بیگ تیار کر دو ——— میں کل اسے لیکر واپس آجاؤں گا۔

بھابی : اے ہے ـــــ آپ تو ایک کی ایک کرنے کا جیسے تہیہ کرکے جارہے ہیں۔ (سمجھانے کے انداز میں) اگر کوئی جھگڑا ہوا تو مصالحت کی کوشش کیجئے گا۔ دو ایک دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا معاملہ ہے۔

بھائی : میں پاگل تو نہیں شکیلہ ـــــ اسی لئے تو جارہا ہوں۔ حالات سدھرنے کے قابل ہوئے تو خیر ـــــ نہیں تو آخری چارہ یہی ہوگا کہ اسے یہاں لے آؤں ـــــ ہمارے سوا زخشی کا اور کون ہے۔ آخری سہارا ہم ہی تو ہیں۔

بھابی : (تیور بدل کر) میں کب کہتی ہوں کہ آپ اسے یہاں نہ لائیں۔ سو دفعہ آئے یہاں۔ لیکن میرا مطلب تو یہ ہے کہ اس کے شوہر کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ کیجئے گا۔ جہاں تک ہوسکے۔ سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کیجئے گا۔ بیاہی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔

بھائی : بشرطیکہ گھر جہنم نہ ہو۔

(سیما ٹائم ٹیبل لے آتی ہے۔ بھائی گاڑی کا وقت دیکھنے لگتا ہے۔ بھابی کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ہیں)۔

(رخشی کا گھر اونچے متوسط طبقے کی نشان دہی کرتا ہے۔ صحن میں رخشی نلکے کے قریب بیٹھی برتن دھو رہی ہے۔ بڑا بچہ دو سالہ گکو فرش پر ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا ہے۔ پلنگڑی پر گود کی بچی سو رہی ہے۔ رخشی کا رنگ زرد، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ بار بار ہلکی ہلکی کھانسی اٹھتی ہے۔ حرارت بھی محسوس ہوتی ہے —— بال بکھرے اور کپڑے میلے سے ہیں۔ رخشی کا بھائی فہیم ہاتھ میں بیگ پکڑے ڈیوڑھی سے صحن میں آتا ہے۔ بہن کی حالت دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ رخشی اپنی سوچوں میں گم آہستہ آہستہ برتن مانجھ رہی ہے۔ چند لمحے خاموشی سے دیکھنے کے بعد فہیم آگے قدم بڑھاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی ہے ——)

فہیم: (غم کی اندوہ ناکی سے بھرپور آواز) رخشی ——

رخشی: (سر اٹھاتے ہوئے) کون؟ (بھائی کو دیکھ کر ایک لمحہ کو گنگ سی ہوتی ہے۔ پھر خوشی کے ایک بھرپور جذبے سے مغلوب ہو کر) بھائی جان —— آپ (آنکھیں کوشش ضبط کے باوجود بھر آتی ہیں —— ہاتھ دھو کر آنچل سے پونچھتے ہوئے بھائی کے قریب آتی ہے) آپ —— بھائی جان ——

فہیم: (فرط محبت سے بہن کو گلے سے لگاتے ہوئے) رخشی —— یہ —— تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ بیمار تھیں تو اطلاع بھی نہ دی —— پہچاننا مشکل ہو گیا

ہے۔ (الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے)

رخشی: (آنسو آنکھوں میں پیتے ہوئے) نہیں بھائی جان ـــ کوئی ایسی خطرناک حالت تو نہ تھی۔ (ہنسنے کی کوشش میں) یونہی بخار آنے لگا تھا۔ ننھی کی پیدائش کی کمزوری تھی۔ آیئے ـــ کمرے میں چلیئے ـــ بیگ مجھے دے دیجئے ـــ کیسے آنا ہوا ـــ بھابی، سیما اور بچے اچھے ہیں نا۔

فہیم: سب اچھے ہیں۔ (بیگ دے دیتا ہے:) تمہاری حالت ـــ

رخشی: (ککو کو اٹھا کر) ماموں آئے ہیں ککو بیٹے۔ سلام تو کرو۔

فہیم: (بچے کو اٹھا کر پیار کرتے ہوئے) بیمار ہو ـــ اور اتنے ڈھیر سارے برتن دھو رہی ہو۔

رخشی: (آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) وہ ـــ وہ ـــ بھائی جان ملازمہ ـــ ہے نا ـــ چھٹی پر ہے ان دنوں ـــ اس لئے۔

فہیم: کون سی ملازمہ ـــ جس کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔

رخشی: (فہیم کے لہجے اور تیوروں سے گھبرا کر) جی ـــ جی ـــ

فہیم: (تلخ لہجے میں) راشد کہاں ہے؟

رخشی: (بھائی کا چہرہ دیکھتے ہوئے) وہ ـــ اندر ہیں۔ ابھی سو رہے ہیں۔

فہیم: (طنزیہ) آٹھ بجے تک سویا پڑا ہے ـــ ہونہہ ـــ

رخشی: بھائی جان ـــ اندر چل کر بیٹھئے تو سہی ـــ کیا ـــ کیا بات ہے ـــ آپ ـــ آپ ـــ

فہیم: راشد رات کس وقت پر آجاتے ہیں۔

رخشی: جی ـــ جی ـــ وقت پر آجاتے ہیں۔

فہیم: شراب کتنی پیتا ہے ـــ اور کتنی آوارہ عورتوں سے دوستی نبھا رہا ہے۔

رخشی: (گھبرا کر) جی ـــ جی ـــ

فہیم : مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو ۔۔۔ مجھے اس کے سارے کرتوت معلوم ہو چکے ہیں ۔

رخشی : (گھبرا کر سامنے کمرے کی طرف دیکھتی ہے) آہستہ بولئے بھائی جان ۔ کہیں ۔۔۔ کہیں وہ ۔۔۔ سن نہ لیں ۔۔۔ (نقاہت سے کھڑے نہیں رہ سکتی ۔۔۔ پلنگڑی پر بیٹھ جاتی ہے)

فہیم : اسے سنانے ہی تو آیا ہوں ۔۔۔ مجھے خط پر یقین نہیں تھا ۔۔۔ لیکن تمہاری حالت جو کچھ ظاہر کر رہی ہے وہ تو اس خط میں بھی نہیں تھا ۔

رخشی : کس خط میں ! کسی نے ۔۔۔ آپ ۔۔۔ کو خط ......

فہیم : ہاں تمہاری ہمسائی نے یہ خط لکھا (جیب سے خط نکال کر دکھاتا ہے) تمہیں تو اپنے آپ پر ترس نہ آیا جو اپنی حالت کے متعلق کچھ لکھ دیتیں ۔ ہاں تمہاری ہمسائی کو ترس ضرور آ گیا ۔ تم تو شاید اس دقیانوسی خیال اور اس فرسودہ روایت کی پابندی کر رہی ہو ۔ کہ ڈولی آئی تھی ۔ اب جنازہ ہی نکلے گا اس گھر سے ۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔ بے وقوف لڑکی ۔۔۔

(رخشی رونے لگتی ہے) رخشی میں تمہیں یوں گھل گھل کر مرنے نہیں دوں گا ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں ۔۔۔ تم میرے گھر میں رہو گی رخشی ۔۔۔ میں تمہارا بھائی ہوں ۔۔۔

رخشی : (آنسو آنچل سے پونچھتے ہوئے) بھائی جان ۔۔۔ آپ کو میرے حالات کا علم ہو ہی گیا ہے ! ۔۔۔ میری ہمسائی نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ اپنی تقدیر پر شاکر ہوں بھائی جان ۔ میرے دکھ میرے ۔۔۔ میرے ہیں بھائی جان ۔۔۔ آپ ۔۔۔

فہیم : رخشی ۔۔۔ تمہارا بھائی تمہارے دکھوں کو بانٹ لینے کا حوصلہ رکھتا ہے ۔ میں اسی لئے تو تمہیں لینے آیا ہوں ۔

رخشی : (سر نفی میں ہلاتے ہوئے پر سوز آواز میں) نہیں بھائی جان ۔۔۔

میں یہیں رہوں گی ــــ یہ میرا گھر ہے۔
فہیم : اسے گھر کہتی ہو یہ تو جہنم کدہ ہے۔ گھر تو جنت ہوتی ہے رخشی ــــ جہاں خلوص، پیار اور محبت کی پرچھائیاں بکھری ہوتی ہیں ــــ یہاں تمہارے لئے مسلسل جلنے والی آگ کے سوا کیا رکھا ہے ــــ (بچے کو گود سے اتار دیتا ہے)۔
رخشی : میری تقدیر میں یہی تھا۔ (اٹھ کر کرسی کھسیٹ لاتی ہے) آپ بیٹھ تو جائیے ــــ
فہیم : (بیٹھتے ہوئے) دو ایک دن کی بات ہوتی تو بات اور تھی ــــ یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے رخشی ــــ چار سال جو تم نے اس جہنم کدے میں گزارے ہیں۔ ان کی اندوہ ناکی کا عکس مجھے تمہارے زرد چہرے ــــ بے نور آنکھوں اور ہڈیوں کے کھڑکھڑاتے ڈھانچے میں دکھائی دے رہا ہے ــــ یہ رشتہ نہیں ظلم تھا ــــ
رخشی : (بھرائی آواز میں) میری قسمت میں یہی تھا۔ تقدیر کی ان دیکھی تحریریں کوئی نہیں پڑھ سکتا بھائی جان۔
فہیم : ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ــــ خود بیمار ــــ چھوٹی سی بچی گود میں اور اس پر ایسی باتیں پٹائی تک سے باز نہیں آتا ــــ انسان ہے یا درندہ ــــ
رخشی : (رونے لگتی ہے۔ بچہ ماں سے لپٹ جاتا ہے) مجھ جیسی سخت جان کو موت بھی گلے نہیں لگاتی ــــ
فہیم : (گلوگیر آواز) مایوس نہ ہو رخشی ــــ میں تمہیں اس جہنم کدے سے نکال کر اپنی چھوٹی سی جنت میں لے جاؤں گا ــــ جہاں تمہاری شفیق بھابی ہے ــــ پیار کرنے والی بہن ہے۔ منے منے پھوپھو کہنے والے بھتیجے ہیں۔
رخشی : خدا آپ کو آپ کی جنت مبارک کرے بھائی جان ــــ میں اپنی بدنصیبی کے تاریک سائے اس جنت پر پڑنے نہیں دوں گی ــــ

فہیم : تم کوئی فکر نہ کرو رخشی —— ہم سب مل کر تمہاری زندگی میں گھلی ہوئی زہرناکیوں کو ختم کر دیں گے۔ تمہاری بھابی تمہارے لئے پریشان تھی۔ سیما نے تو جب سے خط ملا۔ رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔

رخشی : (سر جھکا کر آہستگی سے) سب ٹھیک ہے بھائی جان لیکن ——

فہیم : اب بھی لیکن ویکن کی گنجائش ہے رخشی —— میرا تو خون کھول رہا ہے۔ —— اچھا ہی ہو —— جو میں راشد کا سامنا نہ کروں۔ ورنہ غصے میں کہیں ہاتھا پائی کی نوبت نہ آجائے۔

رخشی : (گھبرا کر) اف —— نہیں بھائی جان —— اپنے آپ کو قابو میں رکھیئے گا۔ میری زندگی جیسی بھی گزر رہی ہے گزرنے دیجئے ——

فہیم : پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو رخشی —— تمہیں گھل گھل کر مرنے کے لئے یہاں رہنے دوں —— دیکھو تو حالت کیا بنا رکھی ہے —— کوئی علاج بھی نہیں ہو رہا ہو گا۔

رخشی : (مظلوم تلخی کے ساتھ) علاج ؛ (آنسو پی جانے کی کوشش کرتی ہے) علاج کی ضرورت ہی نہیں —— اچھا ہے —— جتنی جلدی یہ زندگی ختم ہو سکے —— ہو جائے ——

فہیم : رخشی !

رخشی : میں نے اپنے متعلق آپ کو کبھی کچھ نہیں بتایا تھا —— لیکن میرے گھر کی جلتی آگ آپ نے دیکھ ہی لی —— بھائی جان —— اس آگ سے دور ہی رہیئے —— میں نہیں چاہتی۔ کہ یہ تپش آپ کی جنت تک پہنچ پائے۔

فہیم : خون کے ناطے بھی تو کچھ ہوتے ہیں رخشی —— تم سمجھتی ہو تمہیں اس حالت میں یہیں چھوڑ کر میں چین سے رہ سکوں گا۔

رخشی : آپ پر پہلے ہی سیما کا بوجھ کیا کم ہے بھائی جان —— میں یہیں ٹھیک ٹھیک ہوں۔ یہیں رہوں گی —— میں نے اسی لئے تقدیر کے سامنے سپر ڈال

دی ہے۔ جو پیش آرہا ہے سہہ رہی ہوں۔ (روتے ہوئے) سہتی رہوں گی۔
اس وقت تک ـــــ جب ـــــ

فہیم : بے وقوف نہ بنو ـــــ تیاری کرو ـــــ میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔
اچھی ہو جاؤ گی تو بے شک واپس آجانا ـــــ

رخشی : اچھی ؟

فہیم : مایوسی کی تو کوئی بات نہیں رخشی ـــــ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تمہیں
میرے گھر میں سکون و آرام ملے گا۔ چند دنوں ہی میں ٹھیک نہ ہو گئیں تو کہنا ـــــ

رخشی : آپ کو میرا کتنا خیال ہے (رو دیتی ہے)

فہیم : یہ میرا فرض ہے رخشی ـــــ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں ـــــ

ـــــ ❖ ـــــ

(رخشی پلنگ پر لیٹی ہے۔ نقاہت بدستور ہے۔ ہلکی ہلکی کھانسی بار بار اٹھتی ہے۔ سیما قریب ہی مونڈھے پر رخشی کی ننھی کو لئے بیٹھی ہے۔ فہیم کمرے میں آتا ہے۔ ہاتھ میں پھل کا لفافہ ــــــ اور کچھ ٹیکے اور دوائیاں ہیں ــــــ کمرے کے ننگے فرش پر لکو کھیل رہا ہے۔

فہیم : کیسی طبیعت ہے اب رخشی۔

رخشی : (نقاہت سے) اچھی ہوں بھائی جان۔

فہیم : یہ لو دوائیاں سیما ــــــ انجکشن الگ کر لو ــــــ اور ٹانک الگ۔ یہ مالٹے بھی رخشی کے لئے رکھ دو ــــــ جوس دے رہی ہو نا ــــــ

سیما : بھائی جان باجی جوس پیتی ہی نہیں ہیں۔ (بچی کو پلنگ پر لٹا کر چیزیں پکڑتی ہے)

فہیم : کیوں؟

سیما : آپ ہی پوچھئے ــــــ میں تو جب بھی جوس نکالنے لگتی ہوں۔ منع کر دیتی ہیں۔

فہیم : کیوں رخشی ــــــ تمہیں تو ڈاکٹر نے دو گلاس جوس دن میں پینے کو کہا ہے۔ دوائی بھی وقت پر پی رہی ہو یا نہیں۔

سیما : وہ تو میں دے دیتی ہوں۔ خوراک کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتیں۔

فہیم : رخشی یہ کیا بات ہوئی۔ ڈاکٹر نے ساری ہدایات تمہارے سامنے ہی تو دی تھیں۔ خوراک اور دوائی باقاعدگی سے لیتی رہوگی۔ تو بہت جلد آرام آجائے گا۔

رخشی : سیما یونہی کہہ رہی ہے بھائی جان —— آپ فکر نہ کریں —— (ہلکی سی کھانسی) ——

فہیم : فکر نہ کیا کرو۔ ہنسی خوشی رہا کرو تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔

رخشی : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) فکر کر کے کیا کروں گی بھائی جان —— انہوں نے تو گھر سے نکال دیا —— اب آپ ہی کا سہارا تو ہے —— وہ —— گھر —— تو چھٹ گیا۔

فہیم : اس جہنم اور جہنمی مردود کو یاد نہ کیا کرو رخشی —— یوں سمجھ لو۔ کہ اک بھیانک خواب تھا —— جو ختم ہو گیا۔ ماضی مر جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی لاش کا بار کندھوں پر اٹھائے پھرنا حماقت ہے —— اور تم —— تم تو —— اتنی کمزور ہو بخار رہتا ہے —— کھانسی اٹھتی ہے۔ یہ بوجھ اپنے ذہن سے جھٹک ڈالو —— سیما تم رخشی کو باتوں میں لگائے رکھا کرو نا۔

سیما : میری تو امکانی کوشش یہی ہوتی ہے بھائی جان —— لیکن باجی ہیں۔ کہ ہر وقت سوچوں ہی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ یا کروٹ بدل کر آنسو بہاتی رہتی ہیں۔

فہیم : رخشی !

رخشی : (ڈبڈبائی آنکھوں سے) جھوٹ کہہ رہی ہے سیما میں —— یہاں کیوں رونے لگی —— میں تو بڑے —— آرام سے ہوں —— کوئی کام نہ کاج۔ سارا دن پلنگ پر پڑی رہتی ہوں۔ اور —— اور —— کیا چاہیئے مجھے۔

فہیم : پلنگ پر شوقیہ تو پڑی نہیں رہتیں —— ڈاکٹر نے مکمل آرام کی تاکید کی ہے۔ یوں ہی غم کرتی رہیں۔ تو پا چکی صحت —— رخشی میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔

رخشی : نہ بھائی جان ـــــ ایسا نہ کہئے ـــــ آپ کے سوا ـــــ میرا اب کون ہے (رونے لگتی ہے ـــــ سیما بھی آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہے۔ فہیم بے چین ہو جاتا ہے۔ رخشی کے بستر پر جھک کر اسے پیار سے سمجھانے لگتا ہے)

فہیم : رخشی ـــــ بچوں کی سی عادت ہے تمہاری ـــــ رونے دھونے سے کچھ نہیں بنے گا ـــــ اپنا حوصلہ اور ہمت برقرار رکھو۔ دیکھو تو ـــــ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تمہیں ان کو پروان چڑھانا ہے۔ اس لئے صحت اور زندگی کی ضرورت ہے۔ بخدا اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کیلئے حالات سے نباہ کر لو۔

رخشی : (آنسو پونچھ کر) کوشش تو کرتی ہوں بھائی جان ـــــ لیکن نہ جانے ـــــ کیا محسوس ہونے لگتا ہے ـــــ یوں لگتا ہے جیسے آپ کی ہنستی مسکراتی جنت پر میں اک مہیب سایہ بن کر منڈلانے لگی ہوں۔

فہیم : رخشی ـــــ اپنی سوچ کا انداز بدل دو میری بہن۔ تمہیں میرے گھر میں رہتے ہوئے ایسے اندیشوں کو ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہیئے ـــــ میری مقدور بھر کوشش یہی ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ ـــــ لیکن تم ـــــ شاید ـــــ غیریت کا ـــــ احساس رکھتی ہو ـــــ

رخشی : غیریت نہیں ـــــ صرف ـــــ یہ احساس ہے کہ میری وجہ سے آپ کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے ـــــ

فہیم : تمہیں اس سے کیا؟ ـــــ میں کوئی ایسا کنگال بھی نہیں ہوں۔ اور پھر یہ سب باتیں میرے سوچنے کی ہیں رخشی ـــــ تم اپنے شعور پر یہ بوجھ کیوں اٹھائے رکھتی ہو ـــــ تمہارے بھائی کو قدرت نے بہت بڑا دل دیا ہے ـــــ اور پھر تمہاری بھابی بھی تو پورے خلوص سے تمہیں چاہتی ہے ـــــ (سیما ناگواری سے بھائی کو دیکھتی ہے)

رخشی : (گہری آہ بھر کر) ہاں بھائی جان ـــــ وہ ـــــ میرا بڑا خیال رکھتی ہیں۔

فہیم : پھر بھی ایسی ایسی باتیں سوچتی ہو۔ مہینے بھر میں تو تمہیں رو بصحت ہو جانا

چاہیئے تھا۔ لیکن تمہارے اپنے اندیشوں اور سوچوں نے تمہاری صحت بحال کرنے کی بجائے اور بگاڑ دی ہے۔

رخشی : (مسکرانے کی کوشش کرتی ہے) آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہونے دوں گی بھائی جان ——

سیما : جھوٹا وعدہ کر رہی ہیں نا ——

رخشی : نہیں سیما —— اب میں واقعی بھائی جان کو شکایت کا موقع نہیں دونگی۔

فہیم : میری اچھی بہن۔

سیما : بھائی جان انجکشن آج سے شروع ہونگے۔

فہیم : ہاں میں نے کمپوڈر سے کہہ دیا ہے شام کو آکر انجکشن لگا جایا کرے گا۔ تم ٹمپریچر تو وقت پر لے رہی ہونا ——

سیما : جی ہاں —— چارٹ پر جیسے آپ نے بتایا تھا لکھتی جا رہی ہوں۔

فہیم : بس ٹھیک ہے۔ دوائی وقت پر دیا کرو۔ اور خوراک کا بھی خاص طور پر دھیان رکھو —— ہوں۔

ہاں تو گگو میاں، تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ آؤ جیدی بھیا کے ساتھ چل کر کھیلو ——

رخشی : (جلدی سے) اسے —— اسے یہیں کھیلنے دیں بھائی جان ——

فہیم : (حیران ہو کر) کیوں؟ یہاں ——

(بات ختم ہونے سے پہلے بھابی اندر آجاتی ہے۔ فہیم بچے سے کھیلنے لگتا ہے۔ بھابی کے چہرے پر کچھ ناگواری کے اثرات ہیں۔ لیکن جلد ہی مسکراتے ہوئے رخشی سے مخاطب ہوتی ہے) پلنگ کے قریب آکر۔

بھابی : کیسی ہو اب؟ بخار ٹوٹ گیا۔

رخشی : اچھی ہوں ——

سیما : بخار ابھی اترا نہیں —— ہر وقت حرارت رہتی ہے۔ بھائی جان ——

ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔

فہیم : کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں ـــــ بس کمزوری کہتا ہے۔ رفع ہو گئی تو بخار خود بخود اتر جائے گا۔

بھابی : (ہمدردی جتا کر) اس ڈاکٹر پر تو مجھے قطعاً اعتماد نہیں۔ بس مکسچر دے دیا۔ یا انجکشن لگا دیئے۔ اور کچھ آتا ہی نہیں (فہیم سے مخاطب ہو کر) آپ سے میں نے کہا بھی تھا۔ کہ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کو دکھا دیں۔

فہیم : بھئی دکھائیں گے ـــــ ابھی کچھ دن اس کا علاج تو کر دیکھیں۔ آٹھ نو دن تو کل ہوئے ہیں علاج شروع کئے ہوئے۔

بھابی : آٹھ نو دن میں کچھ تو فرق پڑ جاتا ـــــ مجھے تو رخشی پہلے سے بھی کمزور لگتی ہے۔ (رخشی کا سر تھپ تھپاتے ہوئے۔)

فہیم : کھاتی پیتی کچھ نہیں۔ سیما نے بتایا۔ روتی بھی رہتی ہے۔ اب اس کا کیا علاج ـــــ؟

بھابی : (رخشی سے) کیوں رخشی ـــــ؟

رخشی : (مسکرانے کی کوشش میں) نہیں بھابی ـــــ بھائی جان یونہی کہہ رہے ہیں ـــــ

بھابی : بھئی جلدی جلدی اچھی ہو جاؤ ـــــ رہا رونا دھونا ـــــ تو اس کی کیا ضرورت ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تو ہنسی خوشی اپنے گھر چلی جانا ـــــ کوئی پابندی تھوڑی ہی ہے۔

رخشی : (آہ بھر کر) گھر؟

فہیم : اس گھر کا اب نام ہی نہ لیا کرو شکیلہ ـــــ ہمارے لئے راشد مر گیا۔

بھابی : آپ تو ہمیشہ الٹی ہی بات کریں گے ـــــ اس نے غصے میں گھر سے نکال دیا۔ تو اب یہ بات پلے ہی باندھ لی۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ خدا رخشی کا گھر آباد رکھے۔

فہیم : شکیلہ ! تم تو پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو ـــــ اب رخشی کے وہاں جانے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے ۔ اس جہنم میں جلنے کے سوا اسے اور کیا مل سکتا ہے ـــــ (افسردہ نظر آنے لگتا ہے)

بھابی : (منہ بنا کر) کہتے تو ٹھیک ہی ہیں ـــــ مگر ـــــ خیر ـــــ آپ بڑے ڈاکٹر کو تو دکھا دیں ۔ اس علاج سے تو کوئی افاقہ نظر نہیں آ رہا ۔

فہیم : (ٹہلتے ہوئے) کل اسے بھی دکھا دیتے ہیں ـــــ ہو سکتا ہے اس کی تشخیص کچھ اور ہو ـــــ اور اس کے علاج سے فائدہ بھی جلد نظر آنے لگے ۔

رخشی : نہیں بھائی جان ـــــ یہ دوائی لے رہی ہوں ـــــ (پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے ۔ سیما تکیہ اس کی کمر سے لگا دیتی ہے ـــــ) یہ دوائیاں ختم تو ہوں ـــــ پھر دیکھا جائے گا ۔ (چہرے سے پژمردگی بدرجۂ اتم ظاہر ہے) جانے کتنے کی دوائیاں آ چکی ہیں ۔

فہیم : رخشی ـــــ تم تو ناحق پریشان ہوتی ہو ـــــ (مسکراتے ہوئے شکیلہ کو دیکھ کر) بھئی رخشی کو تو یہی فکر ہے کہ پیسہ خرچ ہو رہا ہے ۔ پگلی سمجھتی ہی نہیں کہ تمہاری صحت کے لئے ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں ۔ کیوں شکیلہ ۔

بھابی : کیوں نہیں جی ـــــ مجھے تو خدا کی قسم دن کو چین ہے نہ رات کو ۔ اچھا میں چلی رخشی کا کھانا تیار کرنا ہے ۔ (چل دیتی ہے سیما بڑے طنزیہ انداز میں اسے جاتا دیکھتی ہے)

فہیم : (اعتماد سے رخشی کو دیکھ کر) تم دیکھ رہی ہو نا ـــــ کتنی اچھی بھابی خدا نے تمہیں دی ہے ۔ ہر وقت تمہارا ہی فکر دماغ پر مسلط ہے ـــــ

رخشی : جی ـــــ جی ـــــ بھائی جان (سیما کے چہرے پر ناگواری سے اثرات ہیں) ـــــ

فہیم : میں ذرا بازار جا رہا ہوں ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دو ـــــ سیما تمہیں کچھ منگانا ہے بازار سے ۔

سیما : نہیں بھائی جان ۔
فہیم : اچھا ——— تم جوس نکال کر رخشی کو پلاؤ ——— (چل دیتا ہے ۔ سیما منہ بنا کر میز کی طرف بڑھتی ہے ۔ مالٹے اور چھری پلیٹ میں رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ۔)
سیما : (بڑبڑاتی ہے) بھابی کا دن رات کا چین ——— تو واقعی ختم ہو رہا ہے ۔ ——— کتنی چالاک ہیں ۔ بھائی جان کے سامنے کس طرح محبت اور ہمدردی کا مظاہرہ کر رہی تھیں ——— لیکن وہ چلے جائیں ——— تو کبھی کمرے میں جھانک کر بھی نہیں دیکھتیں ——— شادو کے لئے دودھ لینے جاؤں تو بڑبڑ کرنے لگتی ہے ۔ (مالٹا چھیلتے ہوئے) گگو ——— جیدی کے ساتھ نظر آجائے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں ——— سیدھے منہ بات نہیں کرتیں ۔ اور اب ——— کس طرح پیار ———
رخشی : (آزارہ بھری آواز) سیما ——— چپ رہا کرو سیما ۔ گھر بھابی کا ہے ۔ میرا نہیں ۔
سیما : ہونھ کہہ کر تیزی سے مالٹا چھیلنے لگتی ہے ۔ رخشی نقاہت سے گرنے کے انداز میں تکیے پر سر رکھ دیتی ہے ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ رہے ہیں ۔)

(بھابی کا کمرہ —— ایک طرف دو پلنگ پڑے ہیں۔ جن پر صاف ستھرے بیڈ کور ہیں۔ دائیں ہاتھ الماری ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو تین صندوق اوپر تلے رکھے ہیں۔ دوسری دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل ہے۔ سامنے سٹول پڑا ہے —— بائیں ہاتھ دو کرسیاں ہیں۔ جن پر بچوں کے دھل کر آئے کپڑے پڑے ہیں۔ بھابی جیدی کے ہاتھ پکڑے اسے پیٹ رہی ہے —— چار سالہ بچہ رو رہا ہے۔ بھابی تھپڑ پہ تھپڑ لگا رہی ہے ——)

بھابی : پھر کھیلے گا گگو کے ساتھ —— بول —— جلدی بول —— جائیگا ان کے کمرے میں —— (جھنجھوڑ کر) میں تیری کھال اتار دوں گی۔ اگر اب تجھے ان کے کمرے میں گگو کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو —— بچہ روئے جاتا ہے) کتنی بار منع کیا ہے۔ سنتا ہی نہیں —— باز ہی نہیں آتا —— (تھپڑ لگا کر) بیٹھے بٹھائے مصیبت آن پڑی —— (اپنے آپ سے) وہ اک سیما ہی کیا کم تھی۔ دوسری کا بوجھ بھی آن پڑا۔ خود تو آئی۔ ان پلوں کو بھی ساتھ اٹھا لائی۔ (بچہ آنکھوں میں مٹھیاں گھسائے روتا چلا جاتا ہے) سیر دودھ تو اس چھٹکو شاور کے لئے چاہیئے باوا کی کمائی جیسے ساتھ لائی ہے —— ہونھ —— اور ان کو تو دیکھو —— (اٹھ کر ٹہلتے ہوئے) اور کچھ سوجھتا بوجھتا ہی نہیں۔ بہن کے غم ہی میں تڑپ رہے ہیں۔ ہونھ —— بہن نہ ہوئی عرش کا تارا ہو گئی —— (بچے سے) اے

چپ کرے گا ـــــ یا لگاؤں ایک اور ـــــ چپ رہ ـــــ خبردار ـــــ بند کر آواز (بچے کو جھنجھوڑتی ہے ـــــ سیما شادو کو اٹھائے اندر آجاتی ہے ـــــ جلدی سے جیدی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے ـــــ بچہ پھوپھو کہہ کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتا ہے)

سیما: (بھابی کی خشک ناکی سے حیران ہو کر) بھابی کیوں مار رہی ہیں اسے۔

بھابی: (غرا کر) چھوڑ دو اسے (بچے کو اپنی طرف کھینچتی ہے)۔

سیما: ہائے اللہ آپ تو بیچارے کو ـــــ

بھابی: تم چپ رہو جی ـــــ میں جانو اور میرا بچہ ـــــ ساری عادتیں بگاڑ لیں ہیں اس نے لکو کے ساتھ کھیل کھیل کر ـــــ دو مہینے ہو گئے لکو کو آئے بچہ بگڑ گیا میرا ـــــ

سیما: (بیچارگی سے) لکو ـــــ وہ بیچارہ تو ـــــ ابھی ٹھیک طرح بول بھی نہیں سکتا۔ دو سال عمر ـــــ

بھابی: (غصے سے) میں کہتی ہوں چپ رہو تم ـــــ بڑے پر نکل آئے ہیں تمہارے بھی۔ بہن کیا آگئی ہے۔ کسی دوسرے کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

سیما: (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) بھابی ـــــ

بھابی: (غصے سے) اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگی ہو شاید ـــــ ہونھ ـــــ (سٹول پر بیٹھ کر بچے کا منہ صاف کرتی ہے)

سیما: (ششدر سی) میں نے کیا کیا بھابی۔

بھابی: (سر ہلا ہلا کر طنزیہ انداز میں) تم نے تو کچھ کیا ہی نہیں ـــــ سارا دن بہن ہے یا بہن کے بچے ـــــ مجھے تو نوکرانی سمجھ رکھا ہے۔ گھر کی دیکھ بھال بھی کروں اور مریضوں کو بھی سنبھالوں۔ پیسہ بھی خرچ کروں اور جان بھی ماروں ـــــ ہونھ

سیما: (افسردگی سے) بھابی ـــــ سکول سے آنے کے بعد جتنا وقت بھی

ملتا ہے — میں کام کرتی رہتی ہوں — باورچی خانے کا بھی اور دوسرا بھی۔

بھابی : (ہاتھ چلا چلا کر) کرتی ہو۔ تو مجھ پر احسان کاہے کا جماتی ہو۔

سیما : (روہانسی ہو کر اور بچی کو کندھے سے تھپک تھپک کر) میں نے کب احسان جمایا بھابی — مجھے تو خود احساس ہے کہ جب سے باجی آئی ہیں کام کافی بڑھ گیا ہے۔ وہ بیمار نہ ہوتیں — تو —

بھابی : (بچے کو گود میں بٹھاتے ہوئے) اب بیمار ہی بنی رہے گی وہ — دو ماہ ہو گئے — پلنگ سے پیر ہی نیچے نہیں اترا — آرام فرمانے آئی ہے نا —

سیما : (رو کر) خدا ایسا آرام کسی دشمن کو بھی نہ دے — باجی کا بخار ہے کہ اترتا ہی نہیں — کھانسی ساری ساری رات چین لینے نہیں دیتی۔ اگر وہ اچھی ہوتیں تو بستر پر شوقیہ تھوڑا ہی پڑی رہتیں۔

بھابی : بات بات پر ٹسوے بہانا آتا ہے دونوں بہنوں کو۔ ہونہہ — باورچی خانے میں جا کر کھانا تیار کرو۔

(سیما آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ بھابی بچے کو چمکارنے لگتی ہے۔ خود پیار کرتی ہے)

بھابی : گگو گندہ بچہ ہے بیٹے — تم اس کے ساتھ مت کھیلا کرو — سمجھے — (بچہ خوش ہو کر اچھلتے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے) سوچا تھا سیما کی شادی کر کے آرام سے بے فکر ہو کر رہوں گی — یہ پتہ نہ تھا — دوسری بلا ایسی گلے آن پڑے گی — کہ چھٹکارے کی امید ہی نہ رہے گی —

(کمرے میں متفکرانہ ادھر ادھر ٹہلنے لگتی ہے)

⁂

(آٹھ بج چکے ہیں۔ فہیم دفتر جا چکا ہے۔ لیکن سیما ننھی شادو کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ رخشی ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہی ہے۔ پلنگ کے قریب میز پر دوائیاں اور کچھ پھل رکھے ہیں۔ گگو ماں کے پلنگ پر بیٹھا کاغذوں سے کھیل رہا ہے۔ سیما سخت اداس نظر آ رہی ہے)

رخشی : (کروٹ بدل کر سیما کو دیکھتے ہوئے) سیما۔

سیما : (سر اٹھا کر) جی باجی ——

رخشی : آج تم سکول نہیں جاؤ گی؟ تیار نہیں ہو رہیں۔

سیما : (سر جھکا کر شادو کو دیکھتے ہوئے) نہیں باجی —— آج میں سکول نہیں جاؤں گی۔

رخشی : (حیرانگی سے) کیوں؟

سیما : چھٹیاں لے لی ہیں۔

رخشی : وہ کیوں؟

سیما : بھابی —— اکیلے سارا کام نہیں سنبھال سکتیں باجی —— میں ان کو مدد دیا کروں گی —— (بچی کو پچکارنے لگتی ہے) شادو اور گگو کو بھی تو سنبھالنا ہوتا ہے۔

رخشی : (دکھ بھری آواز) میری وجہ سے تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔

رخشی : کیا ہوا باجی۔ آپ اچھی ہو جائیں ـــــ بس ـــــ پڑھائی ہوتی رہے گی۔
رخشی : (فیصلہ کن لہجہ) تم سکول جاؤ سیما ـــــ میں بھابی ـــــ کو ـــــ کچھ مدد دیا کروں گی۔
سیما : (دکھ بھرے انداز میں) آپ؟ باجی آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔
رخشی : سیما۔
سیما : جی۔
رخشی : بھابی نے شاید تم سے کچھ کہہ دیا۔
سیما : (جلدی سے مسکرانے کی کوشش) نہیں تو باجی ـــــ انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ـــــ میں نے خود ہی محسوس کیا ہے۔ کہ مجھے انکی مدد کرنا چاہیئے۔
رخشی : (کھانستے ہوئے) جھوٹ کیوں کہتی ہو ـــــ میں سب سمجھتی ہوں۔
سیما : رخشی باجی! آپ ایسی باتوں میں دخل نہ ہی دیا کریں۔ بھابی کی تو عادت بن گئی ہے۔ سارا دن بڑبڑ کرتی رہتی ہے۔ مزاج ہی ٹھیک نہیں رہتا۔
رخشی : (رندھی آواز میں) میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں سیما ـــــ میں نے تو پہلے دن ہی یہ سب کچھ محسوس کیا تھا ـــــ (رونے لگتی ہے) میں بھی کیا کروں سیما۔ بوجھ بن کر ان پر آن پڑی ہوں۔
سیما : باجی ـــــ خدارا ـــــ روییے نہیں ـــــ آپ نے تو رو رو کر ہی اپنی جان تباہ کر ڈالی۔ دن بدن حالت خراب ہی ہوتی جا رہی ہے ـــــ میں تو اب بھابی کے متعلق بھی آپ سے کچھ بات نہیں کرتی ـــــ آپ ناحق ـــــ پریشان نہ ہوا کریں ـــــ ہمارے بھائی جان تو اچھے ہیں نا ـــــ کتنے دکھی نظر آتے ہیں ہر وقت آپ کا فکر ہے انہیں۔
رخشی : (آنسو پونچھتے ہوئے) لیکن ـــــ
سیما : بھابی کی باتوں کا خیال نہ کیا کریں ـــــ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں بھائی جان پر کیسے جادو ڈال رکھا ہے۔ ان کے سامنے کس طرح پیش آتی ہیں۔

جیسے ہمارے غم میں گھلی جارہی ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے۔ کسی دن بھائی جان کو سب کچھ بتادوں۔

رخشی: نہ ـــــ نہ نہ ـــــ سیما ـــــ کسی دن یہ حماقت نہ کر بیٹھنا ـــــ کیوں اپنے بھائی کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا چاہتی ہو ـــــ انہیں ـــــ بھابی کے رویے کا پتہ چل گیا ـــــ تو بہت دکھ ہو گا۔

سیما: وہ زیادتی کرتی رہیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔

رخشی: (گلوگیر آواز میں) ہاں سیما ـــــ ان کا حق ہے۔

سیما: زیادتی کرنے کا؟ اخلاق بھی کوئی چیز ہے ـــــ تقدیر نے آپ کو یہاں لا ڈالا۔ اس میں آپ کا کیا قصور ـــــ ان بچوں سے وہ نفرت کرتی ہیں۔ (روہانسی ہو کر) آپ کے ـــــ ساتھ کس طرح بری طرح ـــــ پیش آتی ہیں۔

رخشی: (گہری آہ ـــــ آنکھوں میں آنسو) یہ میرے نصیبوں کی کوتاہی ہے۔ سیما ـــــ بیاہی لڑکی اپنے گھر میں خوش وخرم ہو تو شفاف پانی کی وہ جھیل ہوتی ہے جس میں چاند تارے اپنا عکس دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھ جیسی بدنصیب لڑکیاں جنہیں شوہروں کے گھر سے نفرت اور حقارت کے تازیانے برسا کر نکال دیا جائے۔ نشیب کی طرح بہنے والے اس گدلے پانی کی طرح ہوتی ہیں جو جوہڑ کی صورت میں جمع ہو جاتا ہے ـــــ (دھیمی آواز) اور جس سے سڑانڈ اور تعفن اٹھتا رہتا ہے۔

سیما: (گھبرا کر) باجی ـــــ باجی ـــــ آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ ہمارے بھائی جان تو خلوص رکھتے ہیں نا ـــــ وہ تو ہمیں بار نہیں سمجھتے ـــــ

رخشی: ہاں سیما ـــــ بھائی جان ہمیں بار نہیں سمجھتے ـــــ لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہیں۔ کہ ہم بار بھی نہیں گراں بار ہیں۔ (کھانسی اٹھتی ہے۔ سیما جلدی سے پانی دیتی ہے۔ رخشی ہانپ جاتی ہے)

سیما: باجی چھوڑیے ان باتوں کو ـــــ دیکھئے شادو ـــــ کتنی پیاری ہو گئی ہے۔ پانچ ماہ کی تو لگتی ہی نہیں (شت شت کر کے بچی کو اچھالتی ہے) دیکھیں

باجی دیکھیں ـــــ کتنا ہنس رہی ہے۔
رخشی : (آنسو پونچھتے ہوئے) اسے میرے سامنے نہ ہنسایا کرو سیما۔
سیما : (حیران ہو کر) کیوں باجی؟
رخشی : اسے جب بھی ہنستے دیکھتی ہوں۔ (سوچتے ہوئے ڈوبی آواز میں) تو اس کی ہنسی کے جلو سے مچلتے آنسو نظر آتے ہیں۔ آہوں کے دھوئیں دکھائی دیتے ہیں۔ بڑی ہو کر آنسو ہی بہایا کرے گی مجھے یاد کر کے ـــــ
سیما : (تڑپ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ جاتی ہے) باجی۔
رخشی : سیما ـــــ میرا شعور ان اندیشوں سے دھندلا رہا ہے۔ جو میرے بچوں کو مستقبل میں پیش آئیں گے۔
سیما : (روئی آواز) باجی آپ ایسے کیوں کہتی ہیں۔ آپ اچھی ہو جائیں گی۔
رخشی : اچھی؟ سیما تم ایکسرے کا نتیجہ چھپا سکتی ہو ـــــ ڈاکٹر کی رپورٹ پوشیدہ رکھ سکتی ہو۔ لیکن (آہ بھر کر) میرے سینے میں جلنے والی آگ مجھے میرے انجام کی خبر دیتی رہتی ہے۔ (کھانسی) میری ـــــ حیات کا تانا بانا جل کر راکھ ہو رہا ہے ـــــ میں جانتی ہوں ـــــ سیما ـــــ سب جانتی ہوں (ہانپنے لگتی ہے)
سیما : باجی (رو دیتی ہے)
رخشی : جس خوفناک مرض میں میں مبتلا ہوں ـــــ اور وہ جس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔
سیما : باجی ـــــ خدا کیلئے باجی ـــــ مایوس نہ ہو جائیے۔ ٹی بی لاعلاج نہیں ہے آپ کا علاج مکمل طور پر ہو رہا ہے ـــــ آپ ٹھیک ہو جائیں گی ـــــ
(دونوں خاموشی سے آنسو بہانے لگتی ہیں)۔

ـــــ ✧ ـــــ

(فہیم اپنے کمرے میں ہے ڈاکٹر بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ بھابی لپک کر اندر آتی ہے۔ فہیم پلنگ کی پٹی پر بیٹھا ہے۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر سر ہاتھوں پر گرا رکھا ہے)

بھابی : (جلدی سے) جی میں نے کہا کیا ہوا ——؟

فہیم : (سر اٹھا کر افسردہ لہجے میں) مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا —— پورا علاج ہو رہا ہے۔ لیکن رخشی صحت پکڑنے کی بجائے دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے اندر ہی اندر سلگ رہی ہے —— اف —— میری بد نصیب بہن۔

بھابی : خالی علاج سے کیا ہوتا ہے اسے تو سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ (آنکھیں گھما کر) سکون اور آرام کی۔

فہیم : میں اسے سکون اور آرام کہاں سے مہیا کروں شکیلہ —— راشد کا دکھ تو۔

بھابی : راشد گیا جہنم میں —— میں تو یہاں اس کے سکون اور آرام کی بات کر رہی ہوں۔

فہیم : (حیران ہو کر) یہاں ؟ یہاں اسے سکون اور آرام نہیں مل رہا۔ کیا ؟

بھابی : (سر نفی میں ہلاتے ہوئے فہیم کے قریب بیٹھ جاتی ہے) خاک مل رہا ہے۔

فہیم : کیا مطلب ؟

بھابی : اجی میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں —— آپ ہیں کہ سن کر دھیان نہیں دیتے۔

فہیم : تمہارا مطلب گگو اور شادو سے ہے۔
بھابی : اور نہیں تو کیا (مجسم ہمدردی بن کر) سارا دن اور ساری رات بیچاری کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک ضد کر رہا ہے کبھی دوسرا۔
فہیم : ضد ؟ ضد تو نہیں کرتے خاص —— ہاں بچے ہی ہیں نا ؟ کبھی کبھار روتے ہیں۔ مچلتے ہیں۔ بس۔
بھابی : (منہ بنا کر) جی —— جیسے آپ تو چوبیس گھنٹے بچوں کے ساتھ ہی تو رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھئے جو سارا دن گھر پہ رہتی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں بچوں کو باپ کے حوالے کیجئے ——
فہیم : (گھبرا کر) لیکن رخشی !
بھابی : (ہمدردی جتا کر) رخشی کی جان عزیز نہیں آپ کو ؟
فہیم : (سر جھکا کر) کیوں عزیز نہیں شکیلہ —— میں تو ہر امکانی کوشش کر رہا ہوں۔
بھابی : اور جو بات خرابی کر رہی ہے۔ اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ بچے سارا دن تنگ کرتے ہیں۔ اور رخشی انہیں دیکھ دیکھ کر نجانے کیا سوچتی رہتی ہے میں کہتی ہوں اس کی زندگی عزیز ہے تو بچوں کو باپ کے پاس بھجوا دیں۔
فہیم : رخشی بچوں کی جدائی برداشت کرلے گی۔
بھابی : جہنم میں جائیں بچے —— سانپ کی اولاد سنپولیا ہی ہوگی۔ ہمیں تو اپنی رخشی کی زندگی چاہیئے۔ (آواز روہانسی بنا کر) بیچاری کا کیا حال ہو گیا ہے۔ دیکھ کر کلیجہ کٹ جاتا ہے۔ آدھی بھی نہیں رہی —— ڈھانچہ بن گئی ہے ہڈیوں کا۔ (آنچل سے ناک رگڑتی ہے)
فہیم : (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) تم سچ کہتی ہو —— ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔
بھابی : علاج کے ساتھ آرام بھی ملے تو اچھی بھی ہو جائے —— اور میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں۔ جب تک بچے یہاں ہیں۔ اسے سکون ملے گا نہ آرام۔
فہیم : تو پھر —— ؟

بھابی : (کامیابی کی امید پاکر) بچوں کو صابر کی ماں کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ رخشی اچھی ہو جائے گی تو پھر لے آئیں گے —— جن کی اولاد ہے سنبھالیں گے وہی۔

فہیم : حوصلہ نہیں پڑتا میرا —— رخشی کیا سوچے گی۔

بھابی : اس کی بات رہنے دیں۔ میں سمجھالوں گی —— میری تو ہر بات مان جاتی ہے —— بڑی پیاری لڑکی ہے۔ بس نصیب پیارے لے کر نہ آئی —— ہاں تو —— صابر کی ماں کے ساتھ ......

فہیم : (سر جھکا کر قدم اٹھاتا ہے) یہ حیلہ بھی کر دیکھو —— (آہ بھر کر) میں ذرا رخشی کو دیکھ لوں ——

بھابی : ہاں ہاں جائیے —— کچھ دیر باتیں کر کے اس کا دل بہلائیے۔ میں تیاری کر کے بچوں کو آج رات کی گاڑی ہی سے بھجوا دوں گی۔

فہیم : (انتہائی سوگوار آواز میں) اچھا ——

بھابی : ہاں تو رخشی سے آپ کسی قسم کا ذکر نہ کیجئے گا۔ میں اسے سمجھالوں گی۔ دو ایک دن غم کرے گی۔ پھر چین آجائیگا۔ دن رات آرام سے رہے گی۔ تو دوائیوں کا بھی کوئی اثر ہو گا۔

فہیم : (ہاتھ ملتے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے) اچھا —— یہ بھی کر دیکھو۔

(بھابی کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ اپنی کامیابی پر پھولی نہیں سماتی۔ چیزیں ادھر سے ادھر اٹھا کر رکھتے ہوئے بولتی جاتی ہے)

بھابی : شکر ہے —— آخر مان ہی گئے میری بات —— بچے تو دفعان ہونگے —— ہر وقت کی چیں چیں —— بلا ٹلے گی سر سے —— دودھ کا خرچ ہی کم نہیں —— پھر اور چیزیں —— ہونہہ —— ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہم نے —— گھر نہ ہوا یتیم خانہ ہو گیا۔ اپنے بچوں کا حصہ کاٹ کر کس فیاضی سے انہیں دے دیتے ہیں —— ہونہہ —— میں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ ان بچوں کو گھر سے نکال کر ہی دم لونگی۔ آج رات ہی بھجوا دونگی ——

(چیزیں اکٹھی کرنے لگتی ہے)

(بھابی اپنے کمرے میں کھڑی سلائیاں بن رہی ہے ـــــ سیما اداس و پریشان کھڑی ہے۔)

سیما : بھابی ـــــ باجی کو اسی کمرے میں رہنے دیں ـــــ وہ دل میں کیا سوچیں گی۔

بھابی : (سلائیاں تیزی سے چلاتے ہوئے) اسی کمرے میں رہنے دوں۔ کیوں جی؟ ہمیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے کیا۔ ہر وقت کی کھاؤں کھاؤں ـــــ کان بھی پک گئے ہیں ـــــ ہائے وائے الگ ـــــ میں کہتی ہوں شام تک کمرہ تبدیل کر لو۔

سیما : لیکن۔

بھابی : لیکن ویکن کچھ نہیں ـــــ جاؤ ملازمہ کو ساتھ لے جاؤ ـــــ اور ڈیوڑھی والا کمرہ صاف کر لو۔

سیما : بھابی ـــــ خدا کیلئے انہیں یہیں رہنے دیں۔

بھابی : (غرا کر) چپ رہو ـــــ تمہاری زبان بہت کھلتی جا رہی ہے، دن بدن۔

سیما : (روہانسی) اس کمرے میں تو ابا جان کے وقت نوکر رہا کرتے تھے بھابی۔

بھابی : (طنزیہ) تو کیا نوکر ساتھ ہی چپک گئے ہیں۔

سیما : بھابی۔

بھابی : (الفاظ پر زور دیکر) جو میں نے کہہ دیا ہے وہی کرو۔ شام تک چیزیں لے جاؤ اس کمرے میں۔ (دانت پیس کر) گھر کو ہسپتال بنا رکھا ہے۔

سیما : (چمک کر) آپ باجی کی حالت دیکھ نہیں رہیں۔ (غصے سے) بچوں کو بھیج کر آپ کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا ابھی (منہ چھپا کر روتے ہوئے) کس قدر نڈھال ہو گئی ہیں میری باجی۔ اب اس کمرے سے نکال دیں گی تو ——

بھابی : (غصے سے پیر پٹخ کر) میں دیکھ رہی ہوں تیرے تیور بدل رہے ہیں۔ اب تو مجھ سے بدکلامی پر بھی اتر آئی ہے۔ (سلائیاں غصے سے پلنگ پر پھینک کر) آلیں آج وہ —— سب کچھ بتاؤں گی —— دیکھ تو کیا حال کرواتی ہوں تیرا ——

سیما : میں نے کیا ہی کیا ہے بھابی —— (دوسرے کمرے سے رخشی کی آواز۔ سیما کو بلا رہی ہے) آئی باجی —— (جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔)

بھابی : (پھر سلائیاں اٹھا کر بننے لگتی ہے —— وہیں کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ساتھ والے کمرے سے رخشی کی کھانسی کی آواز آتی ہے ——) کھاؤں کھاؤں —— سارے جراثیم —— ہمارے اندر جا رہے ہیں —— اف میرا بس چلے تو چارپائی سمیت اٹھا کر باہر پھینک دوں۔

(فہیم کمرے میں آتا ہے۔ پریشان نظر آ رہا ہے۔ گہری آہ بھرتے ہوئے شکیلہ کو دیکھتا ہے)

فہیم : کیا بات ہے ؟

بھابی : اوہ آپ آ گئے —— (اک لمحہ کو گھبرا کر) کچھ نہیں —— کچھ نہیں —— میں کہہ رہی تھی —— کیسی کھانسی اٹھتی ہے رخشی کے —— دل ہلا کر رکھ دیتی ہے —— بیچاری رخشی ——

فہیم : (دوسری کرسی پر بیٹھ کر) شکیلہ —— رخشی کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔

بھابی : ہاں —— مجھے بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔

فہیم : جب سے بچوں کو بھیجا ہے۔ اس کی حالت خراب ہو گئی ہے۔
بھابی : (آنکھیں مٹکا کر) بھئی میں نے خود رخشی سے اجازت لی تھی —— اس نے ہی تو کہا تھا۔ کہ بھیج دو ——
فہیم : تم اس کی عادت کو جانتی ہو۔ ہر بات پر جھک جاتی ہے۔ یہ عادت نہ ہوتی تو آج یہاں اس حالت میں ہوتی؟ (کرسی کے ہتھے پر بے چینی سے ہاتھ مارتے ہوئے) میرا خیال ہے بچوں کو واپس بلالوں۔
بھابی : (بات بدل کر) نئی دوائی لے آئے؟
فہیم : ہاں (کوٹ کی جیب سے چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر) یہ لو۔
بھابی : (دوائی لیتے ہوئے) گولیاں ہیں۔
فہیم : ہاں۔
بھابی : ہائے بیچاری رخشی —— چار ماہ سے دوائیاں کھا رہی ہے۔ انجکشن لگ لگ کر تو بازو چھلنی ہو گئے۔
فہیم : (جھک کر بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے) فائدہ تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ —— مایوسی ہوتی ہے (سیدھے ہوتے ہوئے) ہاں یہ ڈیوڑھی والا کمرہ آج کیوں کھلا ہے۔
بھابی : (ایک دم خوش گوار انداز میں) صفائی کروا رہی ہوں۔ رخشی کو اس کمرے میں رکھیں گے۔
فہیم : (حیرت سے دیکھ کر) رخشی کو اس کمرے میں!
بھابی : ہاں جی۔
فہیم : وہ کیوں؟
بھابی : وہ کمرہ بڑا ہوادار ہے۔ اور الگ تھلگ بھی —— رخشی کو جس آرام کی ضرورت ہے یہاں بالکل نہیں مل رہا —— (بڑی اپنائیت سے) یہاں تو ہر وقت بچوں کا شور رہتا ہے۔ کبھی چیزوں کے گرنے کی آواز —— تو کبھی

برتن اٹھانے رکھنے کی ـــــ وہ کمرہ الگ تھلگ تو ہے نا۔

فہیم : بات تو ٹھیک ہے ـــــ وہ کمرہ واقعی الگ تھلگ ہے۔

بھابی : گلی والی کھڑکیاں کھول دیں ـــــ تو ہر وقت تازہ ہوا ملتی رہتی ہے۔ جو رخشی کیلئے بہت ضروری ہے۔

فہیم : (اسے عقیدت سے دیکھ کر) تم رخشی کا کتنا خیال رکھتی ہو۔

بھابی : (اٹھلا کر) تو کوئی احسان کرتی ہوں آپ پر۔

فہیم : پھر بھی ـــــ میں تمہارا ممنون ہوں (جوتے اتار کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کوٹ اتارنے لگتا ہے)

بھابی : واہ جی ممنون ہونے کی کیا بات (خود بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے) رخشی صرف آپ کی ہی بہن تو نہیں۔ میری بھی تو ہے۔

فہیم : تم عظیم ہو شکیلہ ـــــ ورنہ اکثر گھروں میں بھابیاں نندوں کی جان کی بیری ہوتی ہیں۔ تم بہت اچھی ہو ـــــ یہ میری خوش قسمتی ہے۔

بھابی : (نازاں ہو کر) آپ خواہ مخواہ تعریف کر رہے ہیں ـــــ میں تو کچھ بھی نہیں کرتی ـــــ ہاں رخشی کیلئے دل بڑا دکھتا ہے۔

فہیم : اب خدا ہی رحم کرے ـــــ اپنی طرف سے تو ہم کوتاہی نہیں کر رہے۔

(فہیم کپڑے تبدیل کرنے چل دیتا ہے ـــــ بھابی مسکرانے لگتی ہے۔ بڑی تلخ لیکن فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر ہوتی ہے۔)

(فہیم رخشی کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتا ہے۔ دوسری طرف سے بھابی آجاتی ہے۔ فہیم بے انتہا پریشان اور افسردہ نظر آرہا ہے۔ بھابی اسے وہیں روک کر آواز میں گھبراہٹ کا عنصر شامل کر کے پوچھتی ہے۔)

بھابی : کیوں؟ کیا ہوا ——— بڑے پریشان نظر آرہے ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے کیا؟ بتائیے نا ——— ابھی آیا تھا نا ڈاکٹر ———

فہیم : (گہری سانس) ہاں؟

بھابی : کیا کہتا ہے؟

فہیم : (بے چینی سے) کہے گا کیا سب کچھ تو نظر آرہا ہے۔

بھابی : (ہاتھ ملتے ہوئے) نظر تو واقعی آرہا ہے ——— لیکن ڈاکٹر نے کوئی تسلی نہیں دی کیا؟

فہیم : (نفی میں سر ہلا کر) وہ ——— مایوس ——— ہو چکا ہے ——— (روہانسی آواز میں) لیکن رخشی ———

بھابی : کچھ کہئے بھی ——— مجھے کیسی الجھن ہو رہی ہے۔

فہیم : رخشی سینی ٹوریم جانا چاہتی ہے۔

بھابی : (آنکھوں میں چمک) سینی ٹوریم ———

فہیم : ہاں شکیلہ ——— وہ مصر ہے کہ اسے سینی ٹوریم بھیج دیا جائے۔

بھابی : بیچاری ـــــ سن رکھا ہوگا۔ سینی ٹوریم سے ٹی بی کے مریض شفایاب ہوکر نکلتے ہیں ـــــ

فہیم : (گہری آہ) ہاں ـــــ شاید ہی خیال آیا ہوگا۔

بھابی : تو ـــــ پھر داخل کروا ـــــ ہی دیں ـــــ

فہیم : شکیلہ! پاگل ہو تم بھی ـــــ (حسرت سے) اب اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ سینی ٹوریم لے جانے کو ـــــ (دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا لیتا ہے) رخشی ـــــ میری بدنصیب بہن ـــــ

بھابی : (اس کا ہاتھ پکڑ کر) آپ تو خواہ مخواہ حوصلہ ہار بیٹھے ـــــ خدا مالک ہے۔ کیا عجب سینی ٹوریم جاکر صحت اچھی ہو ہی جائے۔ مایوسی گناہ ہے۔ جب تک سانس تب تک آس۔

فہیم : (آنسوؤں سے رندھی آواز) رخشی ـــــ ختم ـــــ ہو ـــــ چکی ہے۔ صرف سانس ـــــ کا ناطہ ـــــ باقی ہے ـــــ شکیلہ ـــــ میں اس زندہ لاش کو سینی ٹوریم ـــــ کس لئے لے جاؤں۔

بھابی : (ہمدردی سے) آپ تو تاریک پہلو ہی دیکھیں گے ہمیشہ ـــــ میں کہتی ہوں اس میں ہرج ہی کیا ہے ـــــ چلو ـــــ رخشی کی خواہش ہے اسے اس کی خواہش سمجھ کر ہی پورا کر دیں۔ چھ ماہ سے یہاں علاج ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ وہاں ہی سہی ـــــ وہ دل میں کیا سوچے گی ـــــ اس کی خواہش کا آپ کو خیال رکھنا چاہیئے ـــــ سینی ٹوریم ضرور داخل کروا دینا چاہیئے۔

فہیم : (آہ بھر کر) بے فائدہ ـــــ

بھابی : پھر وہی ـــــ میں کہتی ہوں۔ آپ اس کی آخری خواہش سمجھ کر پوری کر دیں۔

فہیم : (ہونٹ کاٹ کر ہاتھ ملتے ہوئے) جانے رخشی کو کیا سوجھی؟

بھابی : مایوس ہو کر یہیں عافیت نظر آئی ہوگی ـــــ آپ ضرور داخل کروا دیں۔

وہاں اس مرض کے بہت بڑے بڑے ماہر ہوں گے ——— کیا عجب رخشی کی صحت بحال ہو ہی جائے۔

فہیم : تم تو بے وقوف ہو بالکل۔ دیکھ نہیں رہیں اس کی کیا حالت ہے۔ اب بھی صحت کی آس لگا رکھی ہے۔

بھابی : (روتی آواز) یہ آس تو آخری دیر تک رہے گی۔ میں تو اس وقت کا تصور بھی نہیں کر سکتی ——— اسی لئے تو کہتی ہوں کہ سینی ٹوریم ضرور داخل کروادیں حسرت تو نہ رہے گی۔ کہ یہ چارہ نہ کیا ———

فہیم : اب تم کو کیسے سمجھاؤں ؟

بھابی : سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ سینی ٹوریم میں داخل کروانے کا دو ایک دن میں بندوبست کریں۔ بس۔

فہیم : (رندھی آواز) شکیلہ اب دوا نہیں دعا کی ——— ضرورت ہے۔

بھابی : میں مایوس نہیں ہوں۔ خدا مردے میں جان ڈال دیتا ہے۔ وہ تو ابھی زندہ ہے۔ آپ تو ناحق ایسی مایوسانہ باتیں کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ داخل کروا دیکھئے۔

فہیم : تم کہتی ہو۔ تو یہ حیلہ بھی کر دیکھتے ہیں ——— (آہ بھر کر) لیکن میں جانتا ہوں کہ فائدہ کچھ نہیں ہو گا ———

بھابی : ہمت کیجئے ——— حوصلہ ہارنے سے کچھ نہیں ہو گا۔

فہیم : جب رخشی ——— کو دیکھتا ہوں ——— تو ——— دل بیٹھنے لگتا ہے شکیلہ ——— ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہتا ہے ——— دیے کی ٹمٹماتی لو ——— کا کیا اعتبار۔ کس وقت ہوا کا جھونکا آئے اور بجھا کر گزر جائے ——— (گہری آہ)

بھابی : مایوسی گناہ ہے گناہ ——— آپ نے تو حد ہی کر دی ——— اور ——— اپنا حال کیا بنا رکھا ہے۔ جائیے نہا دھو کر کپڑے تو تبدیل کر لیجئے۔

فہیم : شکیلہ ـــــ میرا تو کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔
بھابی : حوصلہ رکھیئے۔ حوصلہ رکھیئے ـــــ خدا مالک ہے۔
فہیم : اتنی مدت ہو گئی۔ علاج معالجے میں تم تو جانتی ہی ہو۔ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ پھر بھی ـــــ قدرت کو جانے کیا منظور ہے ـــــ
بھابی : سب ٹھیک ہے۔ آپ سینی ٹوریم لے جانے کا بندوبست کریں میرا دل کہتا ہے رخشی وہاں ٹھیک ہو جائے گی۔

(فہیم گہری آہ بھر کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔
بھابی کھڑی سوچتی رہتی ہے)

ـــــ ❊ ـــــ

(رخشی کا کمرہ ـــــ پلنگ پر لاش سی پڑی دکھائی دیتی ہے۔ سیما پائنتی کی طرف بیٹھی اس کے پاؤں دبا رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔ رخشی باتیں کر رہی ہے۔ کھانسی کا دورہ پڑتا ہے ۔ بے حال ہو کر تکیے پر سر رکھ دیتی ہے ۔)

سیما : آنسو آنچل سے پونچھتے ہوئے) با ـــ جی ـــ

رخشی : (ہانپتے ہوئے) ہاں ـــــ سیما ـــــ کیا ہے ؟ (آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے) رو کیوں رہی ہو۔

سیما : (روتے ہوئے) باجی ـــــ آپ نے کیوں بھائی جان کو سینی ٹوریم جانے کو کہا ـــــ میں آپ کو کبھی جانے نہ دوں گی ـــــ

رخشی : (نقاہت سے) پگلی ـــــ سینی ٹوریم سے اچھی ـــــ جگہ اور کونسی ہو گی ـــــ (کھانسی) سینی ٹوریم کے ٹھنڈے ـــــ درو دیوار ـــــ سسکتی زندگیوں کو ـــــ پناہ دیتے ہیں۔

سیما : باجی ـــــ باجی ـــــ آپ کیوں ایسے کہتی ہیں۔

رخشی : (کھانسی ـــــ پھر ہانپتے ہوئے) سیما ـــــ رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میری بہن تم دیکھ نہیں رہیں ـــــ موت ـــــ کتنی سرعت سے میری طرف بڑھ ـــــ رہی ہے ۔ لیکن ـــــ میں ـــــ میں ـــــ سینی ٹوریم جانا چاہتی

ہوں — کس لئے — جانتی ہو — ؟

سیما : باجی !

رخشی : صحت یاب ہونے کی امید پر نہیں سیما — موت سے گلے ملنے کے لئے ۔

سیما : (روتے ہوئے) باجی ۔

رخشی : (کھانستے ہوئے) میں وہاں — آرام سے مرسکوں گی — سیما —

سیما : باجی — خدا کیلئے ایسی باتیں نہ کیجئے —

رخشی : سینی ٹوریم — مدقوق — چہرے — کھوکھلے ڈھانچے ۔ بے نور آنکھیں — خالی سپنوں سے اٹھتی ہوئی جگر ہلا دینے والی کھانسیاں — (کھوکھلی ہنسی ہنستی ہے)

سیما : باجی — باجی ۔

رخشی : (آواز نقاہت سے ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے) آہ — میرے بچے — گکو شادو — سینی ٹوریم — میں — تو — انہیں دیکھنے کی اجازت ملے گی نا — (کھانسی کا شدید دورہ)

سیما : (رخشی کا سینہ سہلاتے ہوئے) باجی — باجی — کیسی باتیں کر رہی ہیں ہوش میں آئیے — باجی پانی لیں گی — باجی ۔

رخشی : گکو — لڑکا ہے — حالات — جیسے بھی ہوں گے — کسی طور نباہ — کرے گا — لیکن شادو — میری مظلوم بچی — کاش — میرے ساتھ تو بھی مر جاتی — کسی پر بوجھ تو نہ بنتی — کون — کون اٹھائے گا تیرا بوجھ — میری — معصوم — شادو — آہ —

سیما : باجی (روتے ہوئے) باجی — میری طرف دیکھئے — خلاؤں میں کیا دیکھ رہی ہیں —

رخشی : سینی ٹوریم — یم — سینی — ٹور — یم —

سیما : باجی ـــــ ہم آپ کو نہیں بھیجیں گے سینی ٹوریم ـــــ بھائی جان کبھی نہیں بھیجیں گے ـــــ وہ ـــــ کبھی نہیں جائیں گے۔

رخشی : ان کے نہ چاہنے سے ـــــ کیا ہوگا سیما ـــــ بھابی ـــــ بھا ـــــ بی ـــــ

سیما : میں جانتی ہوں باجی ـــــ بھابی یہی چاہتی ہیں ـــــ (سسکیاں لے کر) ان کے دل میں تو رحم کی رمق بھی باقی نہیں رہی ـــــ آپ ہی نے منع کیا ـــــ ورنہ ـــــ میں بھائی جان سے سب کچھ کہنے کو تیار تھی ـــــ انہیں بھی تو پتہ چلتا ـــــ

رخشی : بھائی جان ـــــ کی پریشانیوں ـــــ میں اضافہ ـــــ کر کے ـــــ تمہیں خوشی ہوتی ؟

سیما : اسی لئے تو سب کچھ سہہ لیا ـــــ لیکن آپ نے ـــــ باجی ـــــ اس سے ایسا روگ لگا لیا ـــــ

رخشی : (بات کاٹ کر) میری ـــــ تقدیر میں یہی تھا ـــــ سیما۔ بدنصیبی۔ غالب آتی ہے ـــــ تو ـــــ کہیں پیچھا نہیں ـــــ چھوڑتی ـــــ آگ ـــــ آگ جلا ـــــ ڈالتی ہے۔ شوہر کے گھر ـــــ میں یہ آگ ـــــ ظاہرہ تھی ـــــ شعلے ـــــ تپش ـــــ چنگاریاں ـــــ یہاں بھی ـــــ وہی آگ تھی سیما ـــــ فرق صرف یہ تھا ـــــ کہ ٹھنڈی آگ نظر نہ آئی ـــــ جلائے گی ـــــ آہ ـــــ بھابی ـــــ ان کا رویہ ـــــ ان ـــــ

سیما : باجی ـــــ

رخشی : میری ـــــ بہن ـــــ رو ـــــ رو کر ہلکان ـــــ نہ ہو ـــــ

سیما : باجی۔

رخشی : میں ـــــ سینی ٹوریم ـــــ ضرور جاؤں ـــــ گی ـــــ سیما ـــــ زندگی کی جو ـــــ ساعتیں ـــــ باقی ہیں ـــــ وہ ـــــ وہ اس ٹھنڈی آگ سے دور ـــــ گزریں گی ـــــ (کھانسی کا شدید دورہ ـــــ ہانپتے ہوئے کھانستی ہے ـــــ

کھانس کھانس کر ہانپتی ہے —— سیما سیماب وار بہن پر تصدق ہے ——
کسی طور کھانسی رکتی ہی نہیں —— گھبرا گھبرا کر رخشی کو پکارتی ہے —— رخشی کی
سانسیں غیر ہموار ہونے لگتی ہیں ——)

سیما: (چیخ کر) با —— جی ——

رخشی: (ٹوٹتے الفاظ) بھ —— بھا —— ئی —— جا —— ن —— کو ——
بلا —— لو —— (کھانسی ——) سینی —— ٹو —— ریم —— جانے ——
سے —— پہلے —— ہی کام —— بن گیا —— بھا —— بی —— کو مبارک
—— دو —— مبارک —— دو ——

سیما: (چیخ مار کر بہن سے لپٹ جاتی ہے) با جی ——

(سیما کی چیخیں سن کر فہیم ننگے پاؤں بھاگا آتا ہے —— پیچھے پیچھے بھابی بھی
ہے —— فہیم رخشی —— رخشی چیختا دیوانہ وار بہن کا سر بازوؤں میں لے کر پلنگ
پر جھک جاتا ہے —— رخشی کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ سیما تڑپ رہی ہے۔
—— اور —— بھابی —— کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈھل آتے ہیں ——
جانے سر سے بوجھ اٹھ جانے کی خوشی سے —— یا بد نصیب رخشی کی جواں مرگی
کے احساس سے) ؂

—— ⁘ ——

ماہ رُخ

(کیمرے کی آنکھ کھلتی ہے۔)

یہ گولکنڈہ کے سابق وزیر اعلیٰ میر حیدر جسے میر جملہ بھی کہا جاتا ہے کی صاحب زادی ماہ رخ کی شکار گاہ ہے۔ سورج کی تیز کرنیں ہرے بھرے درختوں کے ٹھنڈے سایوں سے الجھ رہی ہیں۔ ہوا مستانہ روی سے چل رہی ہے۔ کلیوں کی کنواری مہک سبزے کے پھوٹتے شباب سے شرما رہی ہے۔ نیلے آسمان کے جھکتے کناروں پر آوارہ بادل ایک مخمور سی انگڑائی لے رہے ہیں ــــ صاحب زادی اپنی عزیز دوست اور رشتہ کی بہن افشاں کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آرہی ہے۔ اس کے پیچھے چند خادمائیں اور نوجوان کنیزیں تیر کمان اٹھائے آرہی ہیں۔ حسن و جمال کا پیکر ماہ رخ مضمحل اور افسردہ ہے۔ درختوں تلے چاک وچوبند گھوڑے بندھے ہیں ــــ سب یہاں آکر رک جاتی ہیں ــــ سنبل تیر کمان لیے آگے بڑھتی ہے ــــ)

سنبل: بسم اللہ کیجئے بانو ــــ

ماہ رخ: (بیزاری سے تیر کمان ہٹاتے ہوئے) بہتر ہے ہم واپس لوٹ چلیں۔

افشاں: ماہ رخ ـــــ تم بابا سے وعدہ کر کے آئی ہو نا۔

ماہ رخ: (سوگوار آواز میں) ہاں۔

افشاں: تو پھر واپس جانے کا کیا سوال ـــــ شکار کے لیے آئی ہو نا ـــــ اپنا دھیان ادھر ہی مبذول کرو۔

نادرہ: (آگے بڑھ کر) بالو۔ جب آپ یہاں تک آ ہی گئی ہیں۔ تو پھر واپس جانے کا نہ سوچیئے۔

سانولی: دیکھئے نا موسم کتنا حسین و خوش گوار ہے۔

سنبل: دل بہلایئے اپنا صاحبزادی صاحبہ۔

ماہ رخ: (آہ بھر کر) کاش دل ان عارضی سہاروں سے بہل سکتا۔

افشاں: سوچ کے انداز بدل لو ماہ رخ ـــــ خدا کے لیے بدل لو۔ نہیں تو گھل گھل کر تم ختم ہو جاؤ گی ـــــ دیکھو تو کیا حال ہو گیا ہے۔ نصیب دشمناں کوئی بیماری نہ لگ جائے۔

ماہ رخ: (زہر خند) غم بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔

افشاں: ہمت، حوصلے اور صبر سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ماہ رخ: میں سب سمجھتی ہوں افشاں ـــــ لیکن کیا کروں۔ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو ڈھارس نہیں دے سکتی۔ میں دکھ کی اس منزل پر پہنچ چکی ہوں۔ افشاں جہاں سانسیں اتنی زخمی اتنی نڈھال اور اتنی بے بس ہو جاتی ہیں۔ کہ انہیں آہیں اور کراہیں کہنا پڑتا ہے۔

افشاں: (دکھی انداز میں) شجاع بھائی کا غم گمبھیر ہے ماہ رخ ـــــ مجھے اس غم کی المناکی سے انکار نہیں۔ لیکن۔ پھر بھی ـــــ ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ اپنے لیے نہ سہی بابا ہی کے لیے سہی۔

ماہ رخ: بیچارے بابا ـــــ خود تو شراروں کے رقصاں چکروں میں گھرے ہیں۔ زندگی نے کتنے نوکیلے اور زہرناک تیر ان کے بوڑھے سینے میں پیوست

کر دیے ہیں۔ خود غم کی چٹانوں تلے اس طرح دبے ہیں کہ سانس تک، دشواری سے لیتے ہیں ـــــ لیکن مجھے چاہتے ہیں۔ کہ میں ماحول کی ہر خوشبو اپنے میں جذب کر لوں ـــــ پگلی ـــــ انہیں کون سمجھائے کہ روح ناشاد ہو تو خوشبو بس بن کر رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ ہر خوشی غم کا بوجھ بن جاتی ہے۔

(کنیزیں غم زدہ سی نظر آتی ہیں۔ لیکن افشاں ماہ رخ کو زندگی کی طرف لوٹا لانے کا عزم کیے ہوئے ہے ـــــ وہ سنبل سے تیر کمان لے کر ماہ رخ کے قریب آتی ہے ـــــ)

افشاں: ماہ رخ چھوڑو ان باتوں کو ـــــ لو سنبھالو تیر کمان۔ بابا کی خوشی کے لیے آج شکار کھیلو ـــــ دیکھو تو موسم کتنا رنگین ہے۔ اونچے نیچے سرسبز درختوں سے مستیاں کرتی ہوا ـــــ نکھرا ہوا پرشباب سبزہ۔ وہ سامنے سبک خرامی سے بہتی ہوئی مچلتے پانیوں کو آغوش میں لیے پیاری سی ندی ـــــ نیلے ـــــ صاف و شفاف آسمان کی وسعتوں میں کھوئے ہوئے بے سہارا سے پرندے۔

ماہ رخ: (افسردہ سی مسکراہٹ سے) تم ـــــ تم بہت اچھی ہو افشاں میرا غم بٹانے کی کتنی کوشش کرتی ہو ـــــ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں تم بھی میرے ساتھ نہ ہوتیں تو شجاع کی موت کا المیہ میں کبھی برداشت نہ کر سکتی۔

افشاں: تقدیر کے سامنے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس حقیقت پر ایمان لے آؤ تو دکھ آسانی سے جھیلے جا سکتے ہیں۔

ماہ رخ: یہیں سے تو میرا تمہارا نظریاتی اختلاف کا خط کھنچتا ہے افشاں ـــــ میں شجاع کی موت کو تقدیر کا اوچھا وار نہیں سمجھتی ـــــ میرا بھائی طبعی موت مر جاتا ـــــ تو میں تقدیر کے سامنے سر جھکا کر اپنے گرد پھیلتے کرب و اذیت کے سایوں کو اپنی ذات میں اس طرح سمیٹ لیتی کہ دکھ اظہار کی راہ نہ پا سکتا۔ لیکن ـــــ لیکن ـــــ میرا جواں سال بھائی ـــــ اپنی موت تو نہیں مرا۔

وہ تو کینے، حسد اور بغض کی بھینٹ چڑھ گیا۔

نادرہ: (ادب سے) جانے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے بانو ____

ماہ رخ: جانے والے تو لوٹ کر نہیں آتے ____ لیکن دن کے جانے کے بعد پس ماندگان کی زندگی اندھیروں کا سفر تو بن جاتی ہے نا؟

افشاں: نہیں ماہ رخ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ تمہارا اندازِ فکر منفی ہے اسی لیے تو میں تمہارے متعلق فکر مند ہوں۔ شجاع مر گئے۔

ماہ رخ: (بات کاٹ کر) مر نہیں مروا دیے گئے۔

افشاں: ہاں مروا دیئے گئے۔ ظلم کے لمبے ہاتھوں نے عدل و انصاف کی گردن دبوچ لی ____ لیکن ان کی موت اندھیروں پر منتج نہیں ہوتی۔ اس موت سے وہ شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ جس سے مستقبل کی راہیں منور ہو سکتی ہیں۔ اک ظالم اور مردہ حکمران نے شجاع کو بہانے کی آڑ لے کر مروا ڈالا۔ وہ شجاع کی شجاعت، بہادری اور ہر دلعزیزی سے ہراساں تھا ____ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا تختہ الٹ کر شجاع گولکنڈہ کی ریاست کی حکمرانی نہ حاصل کر لیں۔ لیکن وقت کی سزا سنگین ہوتی ہے ماہ رخ شجاع کے خون کی ایک ایک بوند انتقام کی آگ بن چکی ہے، بابا نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بابا ہر وقت ایک ہی بات سوچتے رہتے ہیں۔ ایک ہی بات ____ قطب شاہ ____ والی گولکنڈہ سے انتقام لینے کی بات ____ اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے پُرعزم بابا ایک نہ ایک دن اس عیاش اور جابر بادشاہ کو کسی نہ کسی وسیلے سے ختم کر کے رہیں گے۔

ماہ رخ: ہاں ____ میں بابا کے عزم سے آگاہ ہوں ____ انہوں نے اپنے بیٹے کے خون کے انتقام کی قسم کھا رکھی ہے۔ تم جانتی ہو۔ وہ ننگی زمین پر سوتے ہیں۔

سنبل: ہاں آقا ننگی زمین پر سوتے ہیں۔

افشاں: میں جانتی ہوں۔ اپنے آپ پر جبر و سختی انہیں ان کے عزم کے استحکام کا احساس دلاتی ہے ــــ اسی لیے تو میں پُر امید ہوں۔ کہ شجاع کے خون کی بوندیں شمعیں بن کر روشن ہوں گی۔ ظلم و تشدد کا یہ دور ختم ہو کر اک نیا سورج طلوع ہوگا۔ قطب شاہ اک والی کا نام نہیں۔ جبر و استبداد کے دور کا نام ہے ماہ رخ ــــ شجاع کا خون زمین پر بہہ کر جو لکیریں کھینچ گیا ہے وہ لکیریں نہیں تاریک گوشے سے نورانی منزل کو راستے ہیں ماہ رخ۔ ہمیں اپنے بھائی کی موت پر فخر کرنا چاہیئے نازاں ہونا چاہیئے اس لیے کہ وہ اک تاریک دور کو ختم کرنے کا باعث بنے گا ــــ

ماہ رخ: (متاثر ہو کر) واقعی افشاں تم سچ کہہ رہی ہو ــــ میں نے تو اس رخ سے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

افشاں: سچائی اک اٹل حقیقت ہے ماہ رخ ــــ اس کا وجود دب نہیں سکتا ــــ ہم خوش قسمت ہیں کہ گولکنڈہ کے مقدر کی سیاہیوں کو مٹانے کا کام ہمارے ذمے آلگا ــــ میری روح، میرا جسم، میرا دل، میرا دماغ سچائی کو اجاگر کرنے میں بابا کا ممد و معاون ثابت ہوگا۔ کیا تم اپنے آپ کو اس فرض سے نپٹنے کا اہل نہیں پاتیں ــــ تم ماضی کو بھول جاؤ ماہ رخ۔ حال کو دیکھو اور مستقبل کی متلاشی رہو۔ تمہارے سارے غم منتشر ذروں کی طرح پھیل کر اپنی شدت کا احساس کھو دیں گے۔ تم اک نئے ولولے۔ اک نئے عزم سے جینے کے سہارے تلاش کر لوگی۔

ماہ رخ: یہ حقیقت مجھ پر آج منکشف ہوئی ہے افشاں۔

افشاں: شکر ہے۔

ماہ رخ: تم اب مجھے کبھی شاکی اور گلہ گزار نہ پاؤگی افشاں میں ثابت کر دوں گی۔ کہ میں آہنی فصیل کی طرح مضبوط اور چٹان کی طرح اٹل فیصلہ رکھنے والے

باپ کی بیٹی ہوں ـــــ جیالے اور بہادر بھائی کی بہن ہوں۔

افشاں: (دھیرے سے مسکرا کر) خدا کرے تم ایسا کر سکو ـــــ یقین مانو تم نے حوصلے اور ہمت کا یوں ثبوت دیا۔ تو بابا اپنے مقصد کے حصول میں ڈٹ جائیں گے۔ وہ بہت جلد اپنے سینے کی بھڑکی آگ کو ٹھنڈا کر لیں گے۔ ان کا دھیان صرف ایک ہی طرف ہو گا۔ اب تو ـــــ اب تو تمھیں متفکر و پریشان دیکھ کر مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ اپنی ساری قوت، ساری ہمت تمھیں خوش دیکھنے میں صرف کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو ـــــ وہ اپنا انہماک و توجہ تم پر اس حد تک مرکوز کر دیں۔ کہ ان کے قدموں تلے سے خون کی لکیروں سے بنے راستے مٹ جائیں۔

ماہ رُخ: ایسا نہ سوچو۔ ایسا نہ کہو۔ میں نے وعدہ کیا ہے نا ـــــ کہ میں اب شجاع کی یاد کا سوگ اس اہتمام نہ مناؤں گی۔ بلکہ اس سوگ سے وہ شعاعیں ڈھونڈوں گی۔ جو شعلے اور شرارے بن کر ظلم پر ٹوٹ پڑیں۔ لاؤ میرا تیر کمان (افشاں تیر کمان بڑھا دیتی ہے۔ کنیزیں شاداں نظر آتی ہیں۔ افشاں کے چہرے پر سکون و اطمینان کی لہریں نظر آتی ہیں۔ تیر کمان سنبھال کر ماہ رخ اپنے سفید گھوڑے کی طرف بڑھتی ہے۔ باقی سب بھی اس کی تقلید کرتی ہیں)۔

(شکارگاہ کا غربی حصّہ ــــ جہاں جھاڑ دار پودے درختوں کے تنوں سے الجھے ہیں۔ خودرو جھاڑیاں بے تکے پن سے بڑھتی پھیلتی چلی گئی ہیں۔ کہیں خاردار الجھاؤ ہیں کہیں خودرو گھاس ــــ پانچ سات گھوڑے درختوں تلے کھڑے ہیں۔ ماہ رخ، افشاں اور کنیزیں ایک دوسرے کو استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی ہیں ــــ)

افشاں: میرے خیال میں نادرہ کی نظروں نے دھوکہ کھایا۔ تیر رائیگاں ہی گئے۔

سنبل: نہیں بانو ــــ میں نے بھی ان جھاڑیوں میں کوئی چیز سرکتی دیکھی تھی۔

ماہ رخ: میرا نشانہ خطا نہیں جا سکتا۔

افشاں: لیکن شکار کے آثار تو کہیں دور دور بھی نظر نہیں آتے۔

ماہ رخ: انہی جھاڑیوں یا ان کے عقب میں شکار ٹھنڈا ہو گیا ہو گا ــــ تھا ضرور کچھ نہ کچھ۔ تیر میں نے یونہی نہیں چلا دیا تھا۔

کنیز: تلاش کرتے ہیں۔ ان جھاڑیوں کے پرلی طرف دیکھتے ہیں۔

افشاں: تو چلو ڈھونڈو ــــ کوئی تیتر کوئی بٹیر ــــ زیادہ ہوا تو کوئی جنگلی ریچھ مل ہی جائے گا۔ شیر مارنے سے تو رہیں محترمہ۔

ماہ رخ: (مسکرا کر) اگر شیر ہی مارا ہوا تو ــــ

افشاں: تو میں تعجب اور حیرانگی سے فوراً غش کر جاؤں گی۔

ماہ رخ: اب تو میں اپنے شکار کو ضرور تلاش کروں گی ـــــ تم غش کھانے کی تیاری کرو۔

افشاں: اوہو ایسی خود اعتمادی۔

ماہ رخ: کیوں نہیں ـــــ آؤ ہم اس طرف جھاڑیاں ہٹا کر دیکھتے ہیں۔ سنبل نادرہ تم سامنے جاؤ ـــــ سانولی اور کرن تم دائیں ہاتھ۔ اور (دو کنیزوں کی طرف منہ کر کے) تم ہمارے واپس آنے تک گھوڑوں کے پاس ٹھہرو۔

(کنیزیں مؤدبانہ اثبات میں سر ہلا دیتی ہیں۔ افشاں اور ماہ رخ درختوں کے پودوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے الجھاؤ بمشکل ہٹاتے ہوئے آگے بڑھنے لگتی ہیں۔ دونوں مشتاق نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔)

افشاں: (مسکرا کر) بانو بہتر ہے واپس لوٹ چلیں۔

ماہ رخ: (مذاق نظر انداز کرتے ہوئے کان کھڑے کرنے کے انداز میں افشاں کو دیکھتی ہے) ٹھہرو افشاں۔

افشاں: کیا ہے؟

ماہ رخ: کچھ سرسراہٹ سی ہو رہی ہے۔

افشاں: (کان لگا کر سننے کی کوشش کرتی ہے) واقعی۔

ماہ رخ: (کچھ اتراتے ہوئے) دیکھا نا ـــــ کچھ تو مار ہی لیا۔

افشاں: شیر نہ ہوا تو جنگلی بلی تو ضرور ہی ہو گی۔ آؤ آگے بڑھیں ـــــ ادھر سے آواز ـــــ

ماہ رخ: (بات کاٹ کر) سننا ذرا افشاں ـــــ آواز ـــــ آ رہی ہے۔ (آگے بڑھتی ہیں)

افشاں: ہاں ہاں ـــــ ٹھہرو ـــــ ذرا رک کر سنو ـــــ اے ـــــ یہ ـــــ تو ـــــ

ماہ رخ: (رک کر) یہ تو کسی کے کراہنے کی آواز ہے ____
افشاں: زخمی جانور مختلف آوازیں ____ (آگے بڑھے جاتی ہیں۔ کراہنے
کی مدہم آواز)
ماہ رخ: نہیں نہیں ماہ رخ یہ تو ____ کوئی انسانی آواز لگتی ہے ____
(دونوں تیزی سے جھاڑیاں پھلانگتی ہیں ____ ماہ رخ خاصی بدحواس
نظر آتی ہے۔ کراہنے کی آواز صاف اور قریب ہوتی جاتی ہے)
ماہ رخ: (رک کر) کوئی زخمی تڑپ رہا ہے۔
افشاں: (پریشانی سے) ہاں ماہ رخ آواز دائیں سمت سے آرہی ہے۔
ماہ رخ: (گھبرا کر) میرا تیر کسی انسان ____
افشاں: ضروری نہیں کوئی تیر ہی سے زخمی ہوا ہو۔
ماہ رخ: کوئی سخت اذیت میں ہے جلدی کرو۔ اس تک پہنچیں۔
افشاں: لیکن یہاں اس وقت آیا کون؟
ماہ رخ: شکار گاہ کا کوئی رکھوالا ہو سکتا ہے۔
افشاں: آج تو یہاں کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں۔
ماہ رخ: تم باتیں بناتے جاؤ گی ____ جلدی جلدی ادھر آؤ ____ اب تو آواز
صاف آرہی ہے۔
افشاں: (اس کے شانہ بشانہ آگے بڑھتے ہوئے) وہ ____ وہ سامنے دیکھو اس
درخت کے پیچھے کوئی ____ انسان ہی ہے ماہ رخ ____ لباس ____
سے ____ تو ____
ماہ رخ: (گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے) اُف میرے خدا ____
افشاں: تیز قدم اٹھاؤ ____ (گھبراہٹ سے) جلدی آؤ۔
(ماہ رخ اور وہ بھاگ کر پہنچتی ہیں۔ ایک خوب رُو نوجوان زمین پر
تڑپ رہا ہے۔ تیر اس کے پہلو میں پیوست ہے۔ خون ____ چمکتا تازہ

اور جان دار خون بے دریغ بہہ رہا ہے ۔ لباس سے نوجوان حیدر آبادی روٗسا
میں سے لگتا ہے ۔۔۔)

ماہ رخ : یا خدا ۔۔۔ میرا تیر!

افشاں : تمہارا تیر ہی اسے لگا ہے ۔ آؤ میری مدد کرو ۔ یہ تیر کھینچ کر نکال تو لیں ۔

زخمی : اوہ ۔۔۔ اُف ۔۔۔

(کانپتے ہاتھوں سے دونوں تیر کھینچ کر باہر نکالتی ہیں ۔ ماہ رخ
بیحد پریشان اور حواس باختہ نظر آرہی ہے ۔ افشاں بھی گھبرائی ہوئی ہے
زخمی کھلتی بند ہوتی آنکھوں سے اپنے اوپر جھکی نوجوان لڑکیوں کو دیکھتا
ہے ۔ نقاہت سے وہ بے جان ہوا جا رہا ہے ۔۔۔ تیر نکلنے پر بمشکل
لب ہلاتا ہے ۔)

زخمی : شکریہ ۔۔۔ (آواز مدھم اور کمزور ہے)

ماہ رخ : خون بہت بہہ گیا ہے افشاں ۔۔۔ اسے کسی طرح حکیم جی کے خیمے میں
پہنچانا چاہیئے ۔ کہیں یہ مر نہ جائے ۔۔۔ (حواس باختہ سی ہو کر) یہ کہیں
مر نہ جائے ۔ اُف اللہ ۔

افشاں : تم ذرا اپنے آپ کو قابو میں رکھو ۔ اتنا پریشان نہ ہو ۔۔۔ کچھ سوچنے دو ۔
اسے خیمے تک کیسے لے جائیں ۔۔۔ (گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے ۔)

زخمی : (تڑپ ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ آنکھیں مندھی جاتی ہیں ۔۔۔
لب لرزتے ہیں ۔ کوشش کر کے وہ ماہ رخ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا
ہے ۔۔۔) آپ ؟

افشاں : (گھبراہٹ میں) یہ ماہ رخ ہیں ۔ صاحب زادی ماہ رخ ریاست کے سابق
وزیر اعلیٰ کی بیٹی ۔۔۔

ماہ رخ : آپ کے میرا تیر لگا ہے ۔۔۔ اف خداوندا ۔۔۔ آپ کیسے میرے
تیر کی زد میں آگئے (زخمی پر جھک جاتی ہے ۔۔۔) آپ ۔۔۔ آپ ۔!

زخمی : (خوبصورت مسکراہٹ جس کے جلو میں زخم کی اذیت ہے) ماہ رخ ما ـــ ہ ـــ ر ـــ خ (زخمی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں)

ماہ رخ : (افشاں کو جھنجھوڑکر) کچھ تو کرو افشاں ـــ یہ ـــ بیہوش ہو رہا ہے کہیں ـــ

افشاں : تم اس کی نبض پر ہاتھ رکھو ـــ زخم پر کوئی کپڑا ـــ

ماہ رخ : (بات کاٹتے ہوئے) میں اپنا دوپٹہ رکھ دیتی ہوں ۔ تم بھاگ کر کنیزوں کو آواز دو ـــ ہائے اللہ ـــ جلدی جاؤ ۔ کچھ تو کرو ۔

افشاں : اچھا ـــ تم اس کا خیال رکھو ـــ میں کچھ کرتی ہوں (بھاگتی ہے)

ماہ رخ : (زخمی کے خوبصورت چہرے کو دیکھتی ہے) یا خدا ـــ اسے بچا لینا ۔ یہ بے گناہ میرے تیر سے ہلاک ہو گیا تو ـــ تو مجھے مار ڈالے گا ۔

زخمی : (بمشکل آنکھیں کھول کر) ماہ ـــ رخ ـــ میں ـــ میں ـــ

ماہ رخ : اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر (اپنی ہمت مجتمع کیجئے ـــ آپ مر نہیں سکتے ـــ

زخمی : (ٹھنڈی اور دھیمی مسکراہٹ لبوں پر پھیل جاتی ہے ـــ) میں ـــ خوش قسمت ہوں ـــ (آواز نقاہت سے ٹوٹ جاتی ہے ۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ـــ)

(ماہ رخ اس کا چہرہ ہلاتی ہے ۔ اس کی نبض ٹٹولتی ہے ۔ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی ہے ـــ اچانک درختوں کے جھنڈ سے اک سرگوشی ابھرتی ہے ۔)

مردانہ آواز : عادل !

ماہ رخ : (کچھ خوف زدہ پھر ہمت کرکے) کون ؟ ـــ جو کوئی بھی ہے بخدا ادھر آئیے ۔ اک انسانی جان جا رہی ہے ۔ اک زخمی مر رہا ہے ۔

(ایک اجنبی ایک ہی جست میں جھاڑیاں پھلانگ کر آجاتا ہے اس کی نظر ماہ رُخ پر پڑتی ہے ـــــ پھر وہ زخمی کو دیکھتے ہی چیخ اٹھتا ہے ۔ زخمی پر جھک کر بے اختیار سا ہو جاتا ہے ـــــ)

اجنبی: عادل ـــــ عادل ۔ تمہیں کیا ہو گیا عادل ۔

ماہ رخ: (دریں اثنا کچھ حواس پر قابو پالیتی ہے) انہیں تیر لگا ہے ۔ خون بہت بہہ گیا ہے ۔ انہیں جلدی سے جراح کے خیمے تک لے چلیئے ۔

اجنبی: (ماہ رخ کو دیکھتے ہوئے مہذب انداز میں) خاتون ـــــ آپ ؟ میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کس خاتون سے شرفِ ہم کلامی حاصل ہے ۔

ماہ رخ: میں گولکنڈہ کے سابق وزیر اعلیٰ میر حیدر کی بیٹی ماہ رخ ہوں یہ میری شکار گاہ ہے ۔

اجنبی: اوہ ـــــ معاف فرمایئے گا ـــــ یقین مانیے ہمیں راستہ معلوم نہ تھا ۔

ماہ رخ: اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ انہیں خیمے تک لے چلیں ۔ دیر اندھیر ثابت ہو سکتی ہے ۔

اجنبی: میرا دوست ـــــ

ماہ رخ: بخدا دیر نہ کیجئے ـــــ ہمارے گھوڑے کچھ ہی فاصلے پر بندھے ہیں انہیں اٹھا کر گھوڑے تک لے چلیئے ۔

(اجنبی جھک کر عادل کو دونوں ہاتھوں پہ اٹھا لیتا ہے ۔ ماہ رخ کا خون آلود دوپٹہ زخمی کے سینے پر ہے ـــــ)

رہنمائی فرمایئے ـــــ

آیئے ـــــ

(دونوں آگے پیچھے چلتے ہیں) ۔

(سابق وزیراعلیٰ کی رہائش گاہ ——— بیرونی سمت کا ایک کشادہ اور روشن کمرہ خوبصورتی اور نفاست سے سجا ہوا ہے۔ محرابی دروں پر ریشمی پردے لہرا رہے ہیں۔ زمین پر ارغوانی قالین ہے۔ مرمریں مجسمے محرابی دروں کے قریب ایستادہ ہیں۔ کمرے کے ایک طرف مسند نما مسہری ہے۔ جس پر ریشمی بستر اور کمخواب کے چمکتے تکیوں کے سہارے زخمی دراز ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر جھک آئے ہیں۔ سینے پر پٹیاں بندھی ہیں۔ ریشمی چادر سے اس کا وجود ڈھکا ہے۔ اس کے سرہانے مرمریں میز پر کچھ پھول پڑے ہیں۔ چند نقرئی ظروف ہیں۔ جن میں کوئی مشروب ہے۔ دائیں ہاتھ نشست پر زخمی کا دوست مراد سر نیہوڑائے بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی مترشح ہے اور وہ گھبرا گھبرا کر اپنے زخمی دوست عادل کو دیکھتا ہے۔ جس کے لب کبھی کبھی بے نام سی لرزشیں پیدا کر رہے ہیں ——— محرابی دروں کے بالمقابل ایک مسند پر سابق وزیراعلیٰ تشریف رکھتے ہیں۔ وہ بھی خاصے پریشان نظر آ رہے ہیں۔ صبح طلوع ہو چکی ہے۔ ایک کنیز دیدہ زیب رنگین لباس کی سرسراہٹیں بکھیرتی ہاتھوں میں بلوریں پیالے ہیں دودھ لیے اندر آتی ہے جھک کر آداب بجا لاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ زخمی کے قریب جاتی ہے ———)

کنیز : انہیں ابھی تک ہوش نہیں آیا۔

مراد : (پریشانی کے عالم میں) نہیں۔

کنیز : صاحب زادی صاحبہ بہت پریشان ہیں آقا۔ وہ رات بھر جاگتی رہی ہیں۔

میر حیدر: ماہ رخ بہت زیادہ حساس ہے ——— وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی ہے۔

مراد : یہ صاحب زادی صاحبہ کے جذبات کے تقدس کا ردّ عمل ہے ورنہ ان کا کیا قصور ——— تقدیر عادل کو ان کے تیر کی زد میں لے آئی۔

میر حیدر: عجیب ہی اتفاق ہے مراد ——— جو آپ لوگ شکار گاہ کے اس حصّے میں جا پہنچے۔ ورنہ ہماری بیٹی جب شکار کے لیے جاتی ہیں۔ تو یہ شکار گاہ کسی مرد کے سایے کی متحمل نہیں ہوتی۔

مراد : میں آپ کی نوازش اور ذرہ نوازی کا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔ آپ نے ہماری غلطی کو معاف فرمایا۔ اور کل سے عادل کی دیکھ بھال کرنے میں دن رات کی قید کی بندش بھی توڑ دی۔

میر حیدر: ہمارے آقا عظیم انسان ہیں۔
زخمی کی دیکھ بھال اور نگہداشت ہماری ذمہ داری ہے مراد۔ یہ تم پر احسان ہے نہ عادل پر ——— یہ میری بیٹی کے تیر سے زخمی ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ذمہ داری اب ہمارا فرض بن گئی ہے۔

مراد : میں دلی طور پر آپ کا احسان مند ہوں (زخمی کی طرف دیکھتے ہوئے) کاش انہیں جلد ہوش آجائے ——— ابھی تک ہوش آنے کے کوئی آثار ہی نہیں۔

میر حیدر: حکیم صاحب پُر امید ہیں۔ آج سہ پہر تک انہیں ضرور ہوش آجائے گا۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کے علاوہ گرنے سے گردن پر بھی کچھ ضرب آئی ہے ——— ویسے حکیم صاحب مایوس نہیں۔

مراد : خدا کرے یہ جلد صحت یاب ہوجائیں۔

میر حیدر: ہمیں تم سے بھی زیادہ پریشانی ہے۔ عادل کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا۔ تو میری بچی کا ضمیر اسے کچوکے دے دے کر مار ڈالے گا۔

کنیز: رات بھر اسی بات سے پریشان رہی ہیں۔ کہ ان کے ہاتھوں کسی بے گناہ کی زندگی ختم نہ ہو جائے۔

مراد: آپ انہیں تسلی دیجئے نا ____ قصور ان کا تو نہیں ____ اگر خدا نہ کرے عادل کو کچھ ہو بھی گیا۔ تو انہیں اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ محض تقدیر کا چکر ہو گا۔

میر حیدر: میری بچی ضرورت سے زیادہ حساس ہے مراد ____ شجاع کی موت نے تو اس کا شیرازۂ حیات بکھیر کر رکھ دیا ہے ____ شجاع کے مرنے سے پہلے تو وہ انتہائی لاپرواہ سی لڑکی تھی۔

مراد: شجاع!

میر حیدر: (گہری آہ بھر کر) شجاع میرا ایک ہی بیٹا تھا مراد۔

مراد: وہ ____ وہ فوت ہو گئے ____ کیا؟

میر حیدر: نہیں۔ (چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ آہیں سینے سے ٹکراتی ہیں۔ نگاہیں خلا میں جم جاتی ہیں)

مراد: آپ شجاع کی موت کا ذکر کر رہے تھے۔ (حیران ہو کر میر حیدر کی طرف دیکھتا ہے) ابھی آپ نے یہی کہا نا ____

میر حیدر: وہ مرا نہیں مروایا گیا تھا۔

مراد: اُف ____ کس ظالم نے آپ کا گلستانِ حیات تاراج کر دیا۔

میر حیدر: والیٔ گولکنڈہ قطب شاہ نے۔

مراد: جی؟

میر حیدر: تم ریاست کے رہنے والے بے شک نہیں۔ لیکن قطب شاہ کی کہانیاں تو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہیں۔ اس کی عیاشی اور مکاری

زبان زدِ عام ہے ۔ جس حکمران کے حرم میں ہزاروں رقاصائیں ہیں ۔ جو دن رات شراب کے نشے میں مدہوش رہتا ہے ۔ اس کے چرچے تو دور دور تک پھیلے ہیں ۔ کیا تمہارے سننے میں نہیں آئے ۔

مراد : جی ! بہت کچھ سن رکھا ہے ۔ اس کی عیاشی ، جبر و استبداد ، ظلم و ستم کے چرچے عام ہیں ـــــ مجھے ایسے حکمران سے نفرت ہے ۔

میر حیدر : (اٹھ کر بیتابی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) کیا واقعی تم اس سے نفرت کرتے ہو ـــــ

مراد : کوئی صاحبِ بصیرت انسان ایسے حکمرانوں کو پسند نہیں کرتا ۔

میر حیدر : پھر تو تم ـــــ تم ـــــ

مراد : جی ؟

میر حیدر : کیا عادل بھی تمہارا ہم خیال ہے ۔ (بے تابی مجنونانہ ہو جاتی ہے) نوجوان ! کیا عادل ؟

مراد : جی وہ مجھ سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہے ۔ ریاست میں سیاحت کے شوق میں آئے تھے ۔ لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر جی چاہتا ہے ـــــ

میر حیدر : کیا جی چاہتا ہے ؟

مراد : کہنے کی جرأت نہیں ۔ قطب شاہ آپ کے حاکم ہیں ۔ کہیں سماعت پر بار نہ ہوں میری باتیں ۔

میر حیدر : اوہ ـــــ صاحب زادے ـــــ تم میری روئداد سے آگاہ نہیں ہو تم نہیں جانتے کہ قطب شاہ میرے بیٹے کا قاتل ہے اور بیٹے کا بے گناہ خون میرے اردگرد پھیلی ہوئی آگ بن چکا ہے ۔ میں دن رات اس میں جل رہا ہوں ۔ میں جب تک اس ظالم حکمران سے بدلہ نہ لے لوں گا ، میں چین کی نیند نہیں سو سکتا ـــــ (جذبات میں آواز رندھ جاتی ہے ۔ آنکھوں سے جیسے آگ ابلنے لگتی ہے ـــــ) مجھے یہ سن کر خوشی

ہوئی ہے کہ تم بھی اس عیاش حکمران سے نفرت کرتے ہو۔ مجھے تو یوں لگا ہے۔ جیسے میرے تمہارے راستے ایک ہیں۔

مراد: (کھانس کر آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر معصومیت کا اظہار کرتے ہوئے) میں یہی کہنا چاہ رہا تھا ــــ آقا ــــ

میر حیدر آقا نہیں بابا کہو ــــ خدا نے تمھیں بلا مقصد نہیں بھیجا بیٹے ــــ بابا کہو بابا۔

مراد: بابا (اٹھ کر بابا سے لپٹ جاتا ہے۔)

میر حیدر: (بیحد متاثر) اب میری مشکلیں بہت جلد آسان ہو جائیں گی مراد۔ میں سمجھوں گا شجاع کی جگہ خدا نے دو بیٹے دے دیے ــــ تم اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوگے نا ــــ

مراد: ضرور بابا ــــ

میر حیدر: والی کی خون میں تڑپتی ہوئی لاش دیکھنے کو میری بوڑھی آنکھیں بےچین ہیں ــــ میرے سینے میں انتقام کے الاؤ جل رہے ہیں مراد ــــ میرا شجاع ــــ میرا اکلوتا بچہ ــــ (جوشِ مسرت سے جیسے پاگل ہوا اٹھتا ہے ــــ بے اختیار مراد کو لپٹا لیتا ہے) لیکن اب ــــ اب مجھے کوئی غم نہیں ــــ تم ــــ تم ــــ شجاع کا انتقام لوگے نا ــــ! اور عادل بھی اس کا انتقام لے گا ــــ اُف میں آج کتنا خوش ہوں۔ کتنا خوش ہوں۔ مَیں ماہ رُخ کو بتاتا ہوں ــــ ماہ رخ کو بتاتا ہوں۔

(اپنے بھاری لباس کو لہراتے ہوئے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ مراد کچھ حیران ــــ کچھ ششدر ہلتے پردے کو دیکھتا رہتا ہے)۔

کنیز: (آنچل سے آنسو پونچھ کر) بیچارے آقا ــــ کسی وقت تو یوں لگتا ہے جیسے دماغی توازن برقرار نہیں رہا ــــ انتقام لینے کو تو تڑپتے رہتے ہیں۔

مراد: نوجوان بیٹے کا صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

کنیز: بیٹا بھی تو لاکھوں میں ایک تھا۔ گولکنڈہ کا جیالا سپوت دشمنوں کیلئے برق گراں دوستوں کی روح ــــ آہ کتنی خوبیاں تھیں ہمارے آقازادے میں۔

مراد: قطب شاہ کو اس سے کیا دشمنی تھی ــــ؟

کنیز: قطب شاہ کے حرم کی ایک مجبور و بےبس رقاصہ نے مدد کے لیے ہمارے آقازادے کو پکارا ــــ وہ حرم کی اس گھناؤنی زندگی سے تنگ آچکی تھی ــــ وہ اس قید بےجا سے چھٹکارے کی خواہاں تھی۔

مراد: شجاع نے اس کی مدد کی!

کنیز: وہ اس سے شادی کر کے اس کی گناہ آلود زندگی کی ــــ اس کی داغدار زندگی کی تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے ــــ لیکن بات بڑھ گیا ــــ ظلم کے ہاتھوں نے حق و انصاف کا گلا دبا دیا۔

مراد: بڑی زہرہ گداز داستان ہے۔

کنیز: (رازداری سے) یہ تو مروا ڈالنے کا بہانہ تھا ــــ اصل بات ــــ

مراد: (بےتابی سے) اصل بات کیا تھی؟

کنیز: قطب شاہ کو ڈر تھا۔ کہ شجاع اس کی حکومت کا تختہ پلٹ کر خود حاکم نہ بن بیٹھے ــــ ان کی شجاعت، دلیری اور عوام میں مقبولیت ہی ان کی موت کا سبب بن گئی۔

مراد: کتنا ناروا ظلم ہے۔

کنیز: آقا کی حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ صاحب زادی صاحبہ کی جان کے تو ہمیں لالے پڑ گئے تھے۔ دونوں میں پیار بھی تو بہت تھا ــــ (زخمی کی طرف دیکھ کر چونک جاتی ہے) ان کے لب ہل رہے ہیں۔ شاید ــــ شاید ہوش میں آرہے ہیں۔

(مراد جلدی سے اٹھ کر عادل پر جھک جاتا ہے ــــ ہلتے لبوں سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے ــــ)

کنیز: (جھک کر) کچھ کہہ رہے ہیں۔
مراد: (زیرلب مسکرا کر) بیہوشی میں بھی خواب دیکھ رہا ہے شاید۔
کنیز کیا مطلب؟
مراد: (مسکرا کر پھر عادل پر جھک جاتا ہے ـــــ اس کی آواز اب مدھم۔ لیکن صاف ہے)
زخمی: ماہ ـــ رخ ـــ ماہ ـــ رخ ـــ (کنیز مراد کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے)
مراد: عادل ہوش میں ہو، نا ـــــ آنکھیں کھولو ـــــ دیکھو ـــــ میری طرف دیکھو نا ـــــ

(عادل کی پلکیں اٹھتی گرتی ہیں۔ مراد اس کے ہونٹ پانی سے تر کرتا ہے۔ کنیز بلورین پیالہ مراد کے قریب لے کر کھڑی ہو جاتی ہے)

(ماہ رخ کی نشست گاہ ـــــ کمرہ رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ پردے قالین فانوس مرمریں میز ۔ ـــــ خوابیدہ مجسمے غرضیکہ کمرے کی ہر چیز نفاست اور خوبصورتی لیے ہوئے ہے۔ ماہ رخ ایک مسند پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔ چہرے کی پھیکی رنگت اور آنکھوں کی سرخی شب بیداری کی غمّاز ہے۔ اس نے خوبصورت لباس پہن رکھا ہے۔ لیکن قدرے لاپرواہی سے ـــــ اس کے سامنے چاندی کے ظروف میں کچھ پھل اور کھانے کی چیزیں پڑی ہیں۔ افشاں اپنے گھیر دار لباس پر حریری دوپٹہ اوڑھے اس کے بالمقابل بیٹھی ہے ـــــ)

افشاں: تھوڑا سا کھا لو ـــــ تم نے رات سے ایک دانہ منہ میں نہیں ڈالا۔ نصیبِ دشمناں بیمار ہو جاؤ گی۔ میری اچھی بہن! چند قاشیں سیب ہی کی لے لو۔ (طشتری اٹھا کر بڑھاتی ہے)

ماہ رخ: (طشتری ہاتھ سے پرے ہٹا دیتی ہے) افشاں مجھے بھوک نہیں۔ کنیز کو بلا کر یہ سب چیزیں توشہ خانے میں بھجوا دو۔)

افشاں: کچھ بھی نہیں کھاؤ گی۔

ماہ رخ: (نفی میں سر ہلا دیتی ہے)

افشاں: میری خاطر بھی نہیں۔

ماہ رخ: (بیزاری سے) افشاں تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جب مجھے کوئی پریشانی ہو تو بھوک قطعاً نہیں لگتی اور میری پریشانی سے تم آگاہ ہو۔

افشاں: یہ پریشانی تم نے خواہ مخواہ ہی اپنے حواس پر مسلط کر رکھی ہے۔

ماہ رخ: وہ ..... وہ ..... اگر مر گیا۔ تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرونگی۔ افشاں۔ وہ میرے تیر سے زخمی ہوا ہے ..... اتنا شدید زخمی۔ کہ اتنا وقت گزرنے پر بھی اسے ہوش نہیں آیا۔ (دل تھام کر) خدا جانے کیا ہو جائے۔ اف افشاں ——— میرا ضمیر ———

افشاں: (پریشان ہو کر سر تھام لیتی ہے) ماہ رخ خدا کے لیے ہمت سے کام لو۔ وہ بچ جائے گا۔ حکیم صاحب پُر امید ہیں۔

ماہ رخ: خدا کرے افشاں ——— خدا کرے وہ بچ جائے۔ اگر وہ مر گیا۔ تو۔

افشاں: وہ تو مرتا مرے گا ——— تم ——— غم میں گھل گھل کر ضرور جان سے جاؤ گی۔

ماہ رخ: میں کیا کروں ——— جب خیال آتا ہے کہ میرے ہاتھوں اک بے گناہ کا قتل ہوا ہے۔ ایک انسانی زندگی کا ضیاع ہوا ہے تو میری روح لرز جاتی ہے۔ افشاں ——— (پریشانی کی انتہا ——— افشاں۔ دعا کرو۔ خدا مجھے قاتلہ ہونے سے بچا لے۔ قاتلہ۔ اف ——— قاتلہ ———

افشاں: (چڑ سی جاتی ہے) پیش از مرگ واویلا ——— کہہ دیا ہے وہ نہیں مرے گا نہیں مرے گا ——— نہیں مرے گا۔

ماہ رخ: (ان سنی کر کے) خدا جانے کس گھرانے کی روشنی ہے وہ۔ کس ماں کے دل کا سکون، کس باپ کا پیار اور کس بہن کا دلارا ہے۔ شجاع کی موت نے جانتی ہو نا کس طرح۔ ہمارا گلشنِ حیات تاخت و تاراج کر دیا ہے۔ ہمارے زخمی دلوں سے بد دعائیں خود بخود نکلتی ہیں۔ ہم اپنے بھائی کے قاتل کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں ——— کیا ——— کیا

ایسے ہی جذبات کسی ماں بہن اور باپ کے دل میں میرے لیے پیدا ہو جائیں گے۔

افشاں: (سر تھام لیتی ہے) اور ماہ رخ ——— تم کیا کیا سوچ رہی ہو۔

ماہ رخ: (افشاں کو جھنجھوڑ کر) کیا ہو گا افشاں ——— کیا ہو گا۔ تم ہی بتاؤ نا۔

افشاں: کچھ بھی نہیں ہو گا۔ آسمان گرے گا نہ زمین پھٹے گی۔ وہ اچھا بھلا ہو کر اپنے گھر سدھارے گا۔ اور تم اس عرصے میں اپنی جتنی توانائی ضائع کر چکی ہو گی۔ اس کا مداوا برسوں بھی نہیں ہو سکے گا۔

ماہ رخ: (بیچارگی سے) تو ——— تو پھر میں کیا کروں ——— میں ———

(کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے۔ سامنے پردہ ہٹا کر کنیز اندر آ رہی ہے وہ چلنے سے زیادہ دوڑنے کا انداز اختیار کیے ہے۔ ماہ رخ اور افشاں دونوں بے اختیار مسند سے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں ———)

ماہ رخ: (بے تابی سے) کہو کیا خبر؟ (سانس تیزی سے چلتا ہے)

کنیز: زخمی ہوش میں آ گیا صاحب زادی صاحبہ۔

ماہ رخ: شکر ہے تیرا یا خدا ——— (بے اختیارانہ ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھ جاتے ہیں ———)

افشاں: شکر ہے۔ (کنیز سے) کیا پوری طرح ہوش میں آ گیا ہے۔

کنیز: جی ہاں۔ میں ابھی انہیں کے پاس تھی۔ گھنٹہ بھر سے میں وہاں تھی۔

ماہ رخ: ہوش کب آیا۔ خطرے سے نکل گیا نا وہ ——— ٹھیک ہو جائے گا نا۔

کنیز: (شریر سی مسکراہٹ) تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوش میں آئے ہیں۔

افشاں: (بابا کے آنے کے بعد آیا ہوش ———

کنیز: آقا آپ کے پاس آئے تھے نا ———؟

افشاں: ہاں

ماہ رخ: تم دوسری باتیں چھوڑو زخمی کے متعلق بتاؤ ——— اب اس کی حالت

اچھی ہے نا ——

افشاں: کہہ تو رہی ہے۔ ٹھیک ہے —— زیادہ ہی تردد ہے۔ تو خود جا کر احوال پرسی کر آؤ۔

ماہ رخ: (خوش نظر آتی ہے) اب میں تمہارے مذاق سے نپٹ لوں گی۔ میری جان میں جان آئی ہے۔ میری روح سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ شکر ہے خدا کا وہ بچ گیا۔

کینز: —— اللہ —— آپ نے کتنی پریشانی دیکھی۔

افشاں: وہ تو دم سادھے آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ ناز اٹھوا رہا تھا۔ ادھر رات ہم پر بھاری تھی۔ محترمہ نے خود سونے کی زحمت گوارہ فرمائی نہ ہمیں اجازت بخشی —— اف تکان سے بُرا حال ہو رہا ہے اپنا۔

ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے) آرام فرمایئے جنابہ ——

افشاں: اب تو میں ڈٹ کے سوؤں گی —— تمہارا کیا ارادہ ہے؟

ماہ رخ: میں تو شکرانے کے نوافل ادا کروں گی۔ صدقہ بانٹوں گی۔ خیرات کرونگی۔

افشاں: اللہ —— اللہ —— بڑا خوش قسمت ہے عادل۔ مجھے تو رشک آنے لگا۔

(ماہ رخ حسین سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے افشاں کو دیکھتی ہے)

افشاں: (شوخی سے دیدے مٹکاتی ہے) کہیں —— معاملہ گڑبڑ تو نہیں۔

ماہ رخ: (ادائے دلربائی سے) بکواس نہیں کرو۔

کینز: (شریر سی مسکراہٹ سے) زخمی نے بھی ہوش میں آتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو پکارا۔

ماہ رخ: بکو نہیں (مصنوعی سا غصہ) بڑی باتونی ہو گئی ہے تو بھی۔

کینز: خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھاتی ہوں صاحبزادی صاحبہ۔ اس کے لبوں پر مبہم سی جو آواز تھی۔ وہ آپ کا ہی نام تھا۔ میں اس کے قریب ہی تھی۔

(ماہ رخ کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے) جب تک پوری طرح ہوش نہیں آیا۔
آپ کا نام ہی لرزتا رہا اس کے لبوں پر۔

افشاں: (شکلیں مضحکہ خیز بناتی ہے) میں بھی حیران تھی ــــ اللہ میری توبہ۔

ماہ رخ: (شرمگیں مسکراہٹ سے) کنیز یونہی بک رہی ہے۔ تم اس کی بات پلے نہیں باندھ لو۔ چلو لیٹ جاؤ۔ آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ (اسے مسند پر دھکیل دیتی ہے افشاں اسے چھیڑنے کو دیدے گھماتی اور شکلیں بناتی ہے۔ ماہ رخ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔)

(عادل کی خواب گاہ ــــ سبز اور سنہری رنگوں کا امتزاج دلکش ہے۔ خوبصورتی سے آراستہ چیزیں فانوس کی خواب انگیں روشنی میں چمک رہی ہیں ــــ عادل تکیوں کے سہارے لیٹا ہے ــــ آج چہرے پر قدرے بشاشت ہے۔ لیکن نڈھال اب بھی ہے ــــ میر حیدر بڑی محبت سے اس کی پٹی پر بیٹھے اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ مراد قریبی نشست پر بیٹھا ہے ــــ ماحول خوش گوار ہے ــــ)

میر حیدر: جب تک تمھارے زخم پوری طرح مندمل نہیں ہو جاتے ــــ تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے عادل ــــ میں تمھیں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ کہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو ــــ

عادل: (احسان مندی سے) ذرہ نوازی ہے آپ کی۔

مراد: آپ نے جس خلوص اور محبت کا برتاؤ ہم پردیسیوں سے کیا ہے ہمارا رُواں رُواں احسان کے بوجھ سے دبا ہے ــــ آپ ــــ

میر حیدر: (متانت سے) صاحب زادے تم بار بار احسان کا جتلا کر ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچا رہے ہو ــــ

مراد: معافی کا خواستگار ہوں ــــ

میر حیدر (مسکرا کر) چلو اب تو معاف کیا ــــ آئندہ یہاں سے چلے جانے کا

خیال بھی ابھی دل میں نہ لانا ——— میں تم دونوں کو بیٹا کہہ چکا ہوں۔

عادل: یہ آپ کی فراخ دلی ہے بابا ———

میر حیدر: تو کیا ایسے ہی لپسرانہ جذبات مجھے لوٹانے میں تم بخل سے کام لینا چاہتے ہو۔

عادل: (بے چینی سے) نہیں بابا ——— شرمندہ نہ کریں ——— ہم شاید اس التفات کے حق دار نہیں تھے ——— ہم ———

مراد: (جلدی سے عادل کی بات کاٹ کر) ہم آپ کے فرماں بردار ہیں بابا۔

میر حیدر: (سکون آمیز لہجے میں) تمھاری سعادت مندی سے تو میں بہت سی امیدیں وابستہ کر رہا ہوں بیٹے ——— میں نے اپنی داستانِ غم رات تمھیں پوری تفصیل سے سنائی تھی ——— کیا تم میرے سینے کے جلتے الاؤ کو ٹھنڈا کرنے میں مدد نہ دو گے۔ قطب شاہ نے ظلم کی انتہا کر دی تھی بیٹے۔ وہ تو میری آنکھیں بھی نکلوا کر مجھے اندھا کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ریاست کی اس جاگیر میں پناہ لی ——— گو معاملہ کچھ دب گیا ہے۔ لیکن میں اس بات سے باخبر ہوں کہ مجھے کانٹا سمجھتا ہے ——— میں یہاں نظر بند ہوں۔ اور کسی وقت بھی ———

مراد: جی ہاں ——— اس کی طرف سے کسی وقت بھی آپ پر عتاب نازل ہو سکتا ہے۔

عادل: (عالمِ غیظ میں) عتاب نازل ہونے سے پہلے ہی ہم اس پر قہرِ خداوندی بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس کو نیست و نابود کر دیں گے۔ اس کا سر قلم کر دیں گے۔

میر حیدر: زندگی تم پر اپنی مہربان مسکراہٹیں ہمیشہ نچھاور کرتی رہے بیٹے۔

مراد: بابا ——— آپ بے فکر رہیں ——— ہمارے عزم سے چٹانیں ہل جائیں گی۔ یہ والی کیا وقعت رکھتا ہے ———

میر حیدر: میری بھی آرزو ہے ـــــ میں اس مغرور، سنگ دل اور جابر حکمران کو عرش کی بلندی سے فرش کی پستی میں گرا دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے بچے کے خون کا انتقام نہ لیا۔ تو میری روح بے چین رہے گی۔

عادل: ہم آپ کے بازو بنیں گے بابا۔

میر حیدر: خدا کرے تم جلد اچھے ہو جاؤ ـــــ زخم میں تکلیف زیادہ تو نہیں۔

عادل: (مسکرا کر) مجھے تکلیفیں جھیلنے کی عادت ہے بابا ـــــ اور یہ تو کوئی ایسی تکلیف بھی نہیں۔ آپ نے جس محبت سے میری تیمارداری کی ہے۔ میرا باپ بھی ہوتا تو شاید نہ کرتا ـــــ

میر حیدر: (اٹھتے ہوئے) اچھا تم اب آرام کرو ـــــ مراد تم بھی لیٹ جاؤ۔ آج دن بھر تم گھومتے پھرتے رہے ہو ـــــ تھک گئے ہو گے۔

مراد: (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) آپ بڑے عظیم ہیں بابا ـــــ ہمارا اتنا خیال رکھتے ہیں ـــــ

میر حیدر: (پیار سے اس کی کمر پر تھپکی دے کر) پھر وہی تکلفانہ انداز (مسکرانے لگتا ہے) ـــــ اب آرام کرو برخوردار ـــــ صبح پھر ملیں گے ـــــ شب بخیر ـــــ

عادل، اور مراد: شب بخیر۔

(میر حیدر متانت سے نپے تلے قدم اٹھاتے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ اس کے جانے کا پوری طرح اطمینان کر کے مراد میر حیدر کی جگہ عادل کی پٹی پر آ کر بیٹھ جاتا ہے ـــــ آنکھوں میں چمک ہے جسے کسی طور معصوم نہیں کہا جا سکتا ـــــ عادل خاموش ہے۔ سوچ میں ڈوبی آنکھیں ایک ہی سمت لگی ہیں ـــــ)

مراد: (مسکرا کر عادل پر جھکتے ہوئے سرگوشی کرتا ہے) تقدیر ہم پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان معلوم ہوتی ہے۔

عادل: (حیرانگی سے) کیوں؟

مراد: (اپنے گھیردار لباس کی پٹی کھولتے ہوئے) کیوں؟ تمھیں احساس نہیں کیا؟ ہم اس وقت گولکنڈہ کے سابق وزیراعلیٰ کے گھر میں ہیں عادل (سمجھانے کے انداز میں) میر حیدر کی پناہ میں ـــ جو والیٔ گولکنڈہ کا دشمن ہے ـــ جانی دشمن ـــ

عادل: ہاں ـــ بابا قطب شاہ کے دشمن ہیں۔

مراد: تو ہماری راہیں ہموار ہوگئیں نا ـــ ہمیں بابا سے بہت کچھ مل سکتا ہے وہ ہم پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد کرچکے ہیں۔

عادل: (دکھی انداز میں) جوان بیٹے کی المناک موت بہت بڑا حادثہ ہے کسی وقت تو انہیں حواس پر بھی قابو نہیں رہتا ـــ وہ وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جو شاید انہیں کبھی نہیں کہنا چاہئیں ـــ بیچارے بابا ـــ

مراد: اسی لیے تو کہا ہے، تقدیر ہم پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہے۔ تمھارا تیر کھا کر زخمی ہونا بظاہر اک تکلیف دہ حادثہ ہے، لیکن میں اسے اپنی خوش قسمتی اور کامیابی کا پیش خیمہ کہوں گا ـــ (پٹی اتار کر پلنگ پر ڈالتے ہوئے قبا کے بٹن کھولتا ہے) واقعی قسمت وقت کے ایوان میں وہ مطلق العنان ملکہ ہے۔ جو چاہے تو ناکردہ گناہوں کو بھی سزا دے ڈالے اور چاہے۔ تو کردہ گناہوں کا بھی بار اپنے کندھوں پر لے کر عفو کے سارے دروازے واکر کے انعام واکرام سے بھی مالا مال کردے (جھوم جھوم جاتا ہے) واہ تقدیر۔

عادل: (قدرے تکلیف سے سانس لیتے ہوئے) بہت مسرور نظر آرہے ہو۔

مراد: خوش بختی یوں قدم چومنے لگے تو مسرور ہونے کا موقع نہیں کیا۔

عادل: اتنی خوش فہمی میں مبتلا ہونا حماقت بھی ہو سکتی ہے۔

مراد: نہیں عادل ـــ میں ان چھ دنوں میں ہر چیز۔ ہر واقعے اور ہر لمحے کا

بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا رہا ہوں ــــ مجھے کامیابی یقینی نظر آ رہی ہے۔
ہم وہ سارے راز حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جس کی مغل
حکومت کو ضرورت ہے۔

عادل: (گہری سانس لے کر) ہوں۔

مراد: اور پھر ہمیں اپنی ہمت اور قوت پر بھی بھروسہ ہے۔ بیجاپور کی تسخیر میں تم
جانتے ہو ہمارا کتنا حصّہ ہے۔ شاہی سالارِ اعلیٰ نے یاد ہے نا کن الفاظ
میں ہمیں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ شہزادہ معظم نے ہمیں انعام و اکرام
سے مالا مال کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اور اب تو خود شہنشاہ عالی
وقار نے ہمیں اس مہم کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

عادل: (ایک ہی سمت نظریں جمائے سوچ میں ڈوبا ہے) کیوں؟

مراد: (اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) کیوں دوست کچھ چپ چپ ہو۔
کیا تمھیں اپنی کامیابی یقینی نظر نہیں آتی۔

عادل: میرا زخمی ہونا میرے کام کی راہ میں دیوار بنا ہوا ہے۔ خدا جانے میں
کب ــــ

مراد: (جلدی سے بات کاٹ کر) پاگل کہیں کے۔ تمھارا زخمی ہونا تو ہمارے
لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ــــ

عادل: شاید تمھاری سوچ کا انداز مثبت ہو۔

مراد: عادل ــــ میں نے تمھیں کہا ہے نا کہ ہم اس وقت میر حیدر سابق
وزیرِ اعلیٰ گولکنڈہ کی جاگیر میں اس کی رہائش گاہ میں مقیم ہیں۔

عادل: میں جانتا ہوں۔

مراد: میر حیدر قطب شاہ کی تباہی کے خواہاں ہیں۔

عادل: (بے دلی سے) ہاں۔

مراد: وہ ہم پر اعتماد بھی بہت کر رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ ہم ان

کی ہمسایہ ریاست بیجاپور کے رہنے والے ہیں۔ اور اس دوست ریاست میں بغرضِ سیاحت آئے ہیں۔

عادل: تم نے بابا کو یہی بتایا ہے۔

مراد: ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔ کہ ہم مغل حکومت کے بھیجے ہوئے جاسوس ہیں اور یہاں اس غرض سے آئے ہیں کہ گولکنڈہ کے اندرونی حالات کا جائزہ لیں، خفیہ معلومات حاصل کریں۔ فوجی اہمیت کے راز پائیں —— (جھک کر سرگوشی کے انداز میں) کیوں؟

عادل: ہوں۔

مراد: ہر قدم پر بابا ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں —— گولکنڈہ کے متعلق انہیں کیا معلوم نہیں۔ صرف تین ماہ پہلے وہ اس ریاست کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ کل بابا بتا رہے تھے نا۔ کہ تاناشاہ کو توحرم کی بیس ہزار رقاصاؤں اور ام الخبائث کے پیمانوں ہی سے فرصت نہیں۔ وہ کبھی اپنے صدر مقام حیدرآباد سے باہر نہیں آیا۔

عادل: ہوں۔

مراد: یہ گم صم ہوں ہاں کیا کیے جا رہے ہو —— اپنے یہاں وارد ہونے کے مقصد کو بھول تو نہیں گئے۔

عادل: (قدرے مسکراتے ہوئے) نہیں عادل اپنے مقصد کو تو نہیں بھولا —— البتہ

مراد: (تشویش سے) البتہ کیا؟

عادل: (مسکرا کر) البتہ اپنے آپ کو بھولتا جا رہا ہوں۔

مراد: اوہ —— بڑے رومانی ہو رہے ہو ——

عادل: سینے پہ تیر کا گھاؤ ہے مراد۔

مراد: (شوخی سے) جو خاصہ خطرناک ہے۔

عادل: بالکل!

مراد: دن رات بستر پہ لیٹے لیٹے تصورات کے تانے بانے ہی میں الجھ سکتے ہو۔ تصورات تنہائی کی اذیت کو کم کر دیتے ہیں۔

عادل: میری اذیت تو دن بدن بڑھ رہی ہے۔

مراد: کن چکروں میں ہو ——— (اس کا کندھا ہلا کر) ہوش میں آؤ میاں۔ یہ جذباتی باتیں چھوڑ دو۔

عادل: اگر میں یہ کہہ دوں کہ یہی میری زندگی ہیں تو ———

مراد: ارے تم تو بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔ دل دل کا چکر تو نہیں چلا دیا۔

عادل: (مسکرا کر) دل نذرانہ بن کر کسی کے قدموں میں جانے کو تڑپ رہا ہے مراد۔

مراد: (اچھل پڑتا ہے) کس کے قدموں میں ——— کہیں اس کینر پر تو لٹو نہیں ہو گئے۔ جو دن رات تمہاری خدمت پہ مامور ہے۔

عادل: (مسکراتے ہوئے) میرا ذوقِ نظر اتنا پست نہیں۔

مراد: تو پھر اور کون ہے؟ ———

عادل: ماہ رخ ———

مراد: (ششدر ہو کر) تم نے اسے کہاں دیکھا۔

عادل: بیہوش ہونے سے قبل چند لمحوں کے لیے ——— صرف چند لمحوں کے لیے اسے دیکھا۔ لیکن یہ لمحے میری ہستی کے گرد خوشبو کی طرح پھیل گئے ہیں مراد ——— لمحے کا یہ وار تیر کے وار سے بھی زیادہ شدید تھا۔ وہ۔ وہ۔

مراد: (اس کی ٹھوڑی ہلا کر) نظرِ انتخاب لاجواب ہے۔ لیکن میاں مجنوں تم یہاں عشق فرمانے نہیں آئے کام کرنے آئے ہو۔ اپنے ملک اپنی حکومت اور اپنی فوج کے لیے کام ———

عادل: میں نے اپنے کام سے انکار کیا ہے نہ اس کی اہمیت کو بھولا ہوں۔

مراد: تو پھر مابدولت کی طرف سے اجازت ہے۔ جب تک بستر پر پڑے ہو۔ یک طرفہ عشق ڈٹ کر کیئے جاؤ۔

عادل: یک طرفہ کی مجھے پرواہ نہیں مراد —— تم کیا جانو —— محبت تو اک جگمگاتی روشنی ہے اور ہمارے وجود کائنات میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں نے روشنی کو پانے کا اندھیروں سے سفر شروع کر دیا ہے۔ کون جانے روشنی تک پہنچ پاؤں گا بھی یا نہیں۔ لیکن میں اپنے سفر سے مطمئن ہوں کہ جگمگاتی روشنی میرے دل کے گوشے گوشے میں عکس انداز ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کوئی اور بھی —— (مسکرا دیتا ہے) کوئی اور بھی اس روشنی کے حصول کے لیے اندھیروں سے سفر کی ابتدا کر چکا ہو ——

مراد: (لقمہ دیتے ہوئے) اور اندھیروں کے راہی کہیں راستے ہی میں ایک دوسرے سے مل جائیں —— ایک ہی جگمگاہٹ کی تلاش جو دونوں کو ہوگی۔ ظاہر ہے کہ راستے کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔

عادل: تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

مراد: (اٹھتے ہوئے) اجی صاحب زادے محبت کرنا تمہارا ذاتی معاملہ ہے میں کچھ کہہ نہیں سکتا —— لیکن جس مقصد کے لیے ہم آئے ہیں۔ اس میں تمھاری محبت حارج ہوئی۔ تو یاد رکھنا۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔ مجھے فرض شہنشاہِ عالمگیر اورنگ زیب نے سونپا ہے۔ اور میں اس عتاب کو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ جو فرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں شہنشاہ کی طرف سے ہم پر نازل ہو سکتا ہے۔

عادل: تمھیں یہ وہم کیوں ہونے لگا —— کہ میں ——

مراد: عشق انسان کو نکما اور نا اہل بنا دیتا ہے۔

عادل: یہ تمہاری بھول ہے —— عشق نور ہے۔ عشق روشنی ہے۔ عشق ۔

مراد: بس۔ بس —— میں کچھ نہیں سمجھنے کا —— یہ باتیں اپنے دل سے ہی کرتے رہو —— تمھیں بتا دو کہ اس سلسلے میں میں تمھاری کوئی مدد بھی نہ کر سکوں گا ——

عادل: (شگفتہ مسکراہٹ سے) ایسا تو نہ کہو مراد ــــ تم میرے دوست ہو ــــ جگری دوست ــــ تمہیں تو یوں کہنا چاہیئے۔ کہ عادل اگر تم اندھیروں سے سفر جاری کرنے کے بعد کہیں بھٹک گئے ــــ راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تو میں روشنی کو کھینچ کر تمہاری راہوں میں لے آؤں گا ــــ

مراد: اوہو ــــ (ہنس دیتا ہے ــــ) اچھا اب سو جاؤ اور خوابوں کے الجھاؤ میں کھو جاؤ ــــ مجھے تو امید نہیں کہ تم کبھی اپنی محبوبہ کی ایک جھلک بھی دیکھ سکو گے۔ خواب تمہارے اپنے ہیں۔ خوب لطف اندوز ہوا کرو۔ (اٹھ کر اپنے بستر کی طرف جاتا ہے ــــ عادل خواب ناک نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ مراد بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا ہے اور سو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ریشمی چادر سینے تک کھینچ لیتا ہے۔)

ــــ۔۔ــــ۔۔ــــ

(شام کی سانولی دلہن کا آنچل لہرا رہا ہے ـــــ پرندے اپنے بسیروں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ درختوں اور پودوں میں ہوا تھم تھم کر سرک رہی ہے ـــــ ماہ رخ ایک پرانے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ اس نے ہلکے رنگ کا لباس پہن رکھا ہے۔ دوپٹے کے کناروں پر ٹکی سنہری گوٹ اس کے خوبصورت چہرے کا ہالہ کیے ہے گھیردار پشواز اور حیدر آباد پاجامے نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کانوں کے جڑاؤ آویزے گالوں کو چھو رہے ہیں وہ کچھ اداس کچھ پریشان نظر آ رہی ہے ـــــ تنے سے ٹیک لگائے خیالوں میں گم ہے ـــــ پیچھے سے افشاں تقریباً ویسے ہی لباس میں آتی ہے ـــــ چند لمحے کھڑی رہتی ہے۔ لیکن ماہ رخ کو اس کی آمد کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھتی ہے۔ اور زور سے ماہ رخ کے کندھے پر ہاتھ مارتی ہے ـــــ ماہ رخ گھبرا کر پلٹتی ہے ـــــ)

: افشاں ـــــ تم ـــــ ڈرا ہی دیا مجھے ـــــ

افشاں: (اس کے سامنے آکر) کیا بات ہے۔ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو۔

ماہ رخ: (قدرے اداس آواز میں) کچھ نہیں ـــــ یونہی کھڑی ڈوب جانے

والے سورج کی روشنی کو اندھیروں میں سمٹتے دیکھ رہی تھی ـــــ اندھیروں کی لانبی لانبی زبانیں روشنی کو چاٹ گئیں۔

افشاں: (مسکرا کر) تو اس میں افسردہ ہونے کی کیا بات ہے بانو ـــــ صبح طلوع ہوگی ـــــ تو (ماہ رخ کا انداز اختیار کرتے ہوئے) تو روشنی کی لانبی لانبی زبانیں اندھیروں کو چاٹ جائیں گی۔ ادلے کا بدلہ۔

ماہ رخ: روشنی اور اندھیروں کی جنگ ازل سے ہی جاری ہے۔ کون جانے فتح کس کی ہوگی۔

افشاں: اتنے دقیق فلسفوں میں گم ہونے کی ضرورت نہیں۔ روشنی روشنی ہے اور اندھیرے اندھیرے۔ کوئی فاتح ہے نہ مفتوح۔ زندگی کے ایوانوں سے ان کے گزرنے کے وقت معین ہیں ـــــ اور بس۔

ماہ رخ: کتنی اچھی ہو تم افشاں ـــــ کہ تمہیں اندھیروں کا احساس ہے نا روشنی کی اہمیت جانتی ہو۔

افشاں: آج تم کیا ڈوبی ڈوبی گہری گہری باتیں کر رہی ہو ماہ رخ ـــــ شام ہوگئی تمہیں آج شجاع بھائی کی قبر پر چراغ روشن کرنا بھی بھول گیا۔

ماہ رخ: کیا تم سمجھتی ہو کہ میں یہ بات بھول سکتی ہوں؟

افشاں: تو چلو پھر۔

ماہ رخ: میں چراغ روشن کر کے ہی ادھر آئی تھی۔

افشاں: (حیرانگی سے) واقعی؟

ماہ رخ: (افسردگی سے) ہاں افشاں۔

افشاں: اکیلے گئی تھیں ـــــ یا کوئی کنیز۔

ماہ رخ: کسی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت میں محسوس نہیں کرتی۔

افشاں: آج تم نے میرا بھی انتظار نہ کیا۔

ماہ رخ: تم ابھی بھی جا سکتی ہو ـــــ میں تو وہاں اپنا فریضہ ادا کرنے جاتی

ہوں —— تم فاتحہ کہنے کسی وقت بھی جا سکتی ہو ——

افشاں : کہہ تو ٹھیک رہی ہو —— لیکن مجھے بھی ساتھ لے جانے میں تمھیں کیا فرق پڑتا ہے۔

ماہ رخ : چلو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ——

افشاں : بات بڑی کیوں نہیں —— (خفگی سے) میں دیکھ رہی ہوں چند دنوں سے تم الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتی ہو —— گم صم —— چپ چاپ۔

ماہ رخ : (مسکرانے کی کوشش کرتی ہے) تمھیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

افشاں : (منہ پھلا کر) گویا تم مانتی ہو کہ تم الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتی ہو۔

ماہ رخ : میرا جواب اثبات میں ہو تو ——

افشاں : تو میں روٹھوں گی نہیں —— بلکہ حکماً وجہ پوچھوں گی —— (اس کا گال تھپک کر) سمجھیں —— میرا نام افشاں ہے —— تمھیں اس کی وجہ بتانا پڑے گی ——

ماہ رخ : (ایک دم سنجیدہ ہو جاتی ہے) وجہ تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ تمھیں کیا بتاؤں گی۔ بس یہی جی چاہتا ہے —— جی چاہتا ہے —— ؟

افشاں : (دلچسپی سے) کیا جی چاہتا ہے ؟

ماہ رخ : پتہ نہیں (ہنس دیتی ہے)

افشاں : پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ (غور سے ماہ رخ کو دیکھتی ہے۔ ماہ رخ پھر سنجیدہ نظر آنے لگتی ہے۔)

ماہ رخ : کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے پاگل ہو جاؤں گی —— مجھے خدا جانے کیا ہوتا جا رہا ہے افشاں —— میرا دل سخت گھبراتا ہے —— الجھنیں —— پریشانیاں ——

افشاں : (قدرے گھبرا کر) تم ٹھیک تو ہو۔

ماہ رخ : (چند قدم اٹھا کر دوسرے درخت کی جھولتی شاخ کو تھام لیتی ہے)

میں یہ بھی نہیں جانتی ـــــ مجھے کیا ہوتا جارہا ہے۔ گردوپیش سے کبھی خوف آنے لگتا ہے۔ تو کبھی اس میں مدغم ہو جانے کو جی مچلتا ہے ـــــ شب و روز کی تفریق بھی مٹتی جارہی ہے ـــــ میں کل آدھی رات سے طلوعِ آفتاب تک چمن میں ٹہلتی رہی ہوں۔

افشاں: ذہنی طور پر سخت پریشان معلوم ہوتی ہو۔

ماہ رخ: ہاں۔

افشاں: لیکن یہ پریشانی کیوں ـــــ (ماہ رخ کا چہرہ دیکھتی ہے ـــــ پھر قریب آ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔) ایک بات پوچھوں۔

ماہ رخ: (اثبات میں سر ہلا کر) ہوں۔

افشاں: سچ سچ بتادو گی۔

ماہ رخ: (بیزاری سے) تمہید کو اتنی طوالت نہ دو۔ میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

افشاں: کیا تمھیں! ـــــ تمھیں عادل کا خیال!

ماہ رخ: (چہرہ چھڑا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے) میں کیا کروں افشاں۔

افشاں: اللہ ـــــ میں اب سمجھی۔

ماہ رخ: (افشاں کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے اور بے بس آواز میں کہتی ہے) میں اس کے خیال سے جتنا چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اتنا ہی میرے حواس پر مسلط ہوتا جارہا ہے افشاں ـــــ

افشاں: (اسے ساتھ لپٹا کر) تو یہ بات تھی ـــــ

ماہ رخ: ہاں ـــ مجھے اقرار ہے ـــــ لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

افشاں: اتنے زور شور سے گھبرانے کی کیا بات ہے۔ (اسے تھپکاتے ہوئے) عادل تمہارے خیالوں میں آ ہی بسا تو اس میں تردد کی کیا بات ہے۔

ماہ رخ: (الگ ہو کر رخ دوسری طرف پھیر لیتی ہے) مجھے ڈر لگتا ہے۔
افشاں: کس بات کا۔
ماہ رخ: لہروں کے گیت مونگے اور سیپ کے سینوں میں بند ہوتے ہیں افشاں۔ انہیں کوئی نہیں سن سکتا۔ لیکن جب کان لگا کر کوشش کی جائے تو سینوں میں مقید لہروں کے گیت کانوں میں اترنے لگتے ہیں۔ عادل کی محبت لہروں کے گیت کی طرح میرے دل میں مقید ہے۔ ڈرتی ہوں کان لگا کر لوگ سننے لگے تو کیا ہوگا۔
افشاں: تم بے حد جذباتی لڑکی ہو ماہ رخ —— میرا تمھارا ہمیشہ نظریاتی اختلاف رہا ہے۔ تم بے فکر رہو —— کوئی تمھارے دل کے رازوں سے آشنا ہونے کی جرائت نہیں کر سکتا۔
ماہ رخ: (بے اعتباری سے) تم جان گئی ہو نا —— اسی طرح ایک دو تین اور پھر بہت سے لوگوں کو پتہ چل گیا —— تو ——
افشاں: (مذاق سے) یہ مجھ پر چھوڑ دو —— ایک دو تین اور پھر بہت سے لوگوں کو پتہ اسی وقت چلے گا۔ جب تم عادل کی دلہن بن کر ہمیں ——
ماہ رخ: (شرم سے سرخ ہو جاتی ہے) تم بہت بے باک ہو۔
افشاں: شرمانے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تو تمھارے دل کی بات کہہ دی نا۔
ماہ رخ: (چیخ کر) افشاں۔
افشاں: (اسی انداز میں) ماہ رخ۔

(دونوں مسکرانے لگتی ہیں —— اور پھر بے اختیارانہ ایک دوسرے سے لپٹ جاتی ہیں)۔

(چاندنی فضا میں نورانی غبار بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ رنگا رنگ پھولوں کی خوشبو اس غبار سے لپٹی ہوئی ہے۔ دیو قامت درخت ایستادہ ہیں۔ اور خوبصورت لچکیلی بیلیں ان کے تنومند تنوں سے والہانہ لپٹی ہیں۔ مرمریں بارہ دری پر چاند کی کرنیں پھیل رہی ہیں۔ پرندے سو چکے ہیں۔ بسیرے پرسکون ہیں۔ ہوا بھی تھم تھم کر چل رہی ہے —— بارہ دری کی مرمریں سیڑھیوں پر عادل بیٹھا ہے۔ اس کے زانو پر بربط پڑا ہے۔ اس کی انگلیاں حسین اور رسیلے نغموں کو جنم دے رہی ہیں۔ چاندنی اور خوشبوؤں کا غبار سروں سے مرتعش ہے۔ عادل کی خوابیدہ آنکھوں میں جاگتے خواب ہیں۔ اس کے سینے پر ابھی تک پٹی بندھی ہے۔ زخم بھر رہا ہے۔ لیکن زخم کی اذیت چین نہیں لینے دیتی —— وہ اس وقت بے خودی کے عالم میں بربط کے تاروں سے دل کی آواز فضا میں بکھیر رہا ہے —— کینز چند قدموں کے فاصلے پر اس کی محویت ٹوٹنے کی منتظر ہے —— سحر پھیلتا جا رہا ہے۔ کینز بھی نغموں کی لے میں ڈوب جاتی ہے —— اور پھر آہستہ آہستہ نغمہ ڈوبنے لگتا ہے۔ انگلیاں سست پڑنے لگتی ہیں۔ کینز قدم اٹھا کر آگے بڑھتی ہے۔ نغمہ ڈوب جاتا ہے۔ عادل اپنی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے سوچوں میں گم ہو جاتا ہے۔)

کنیز: (قدم بڑھا کر اس کے قریب آتی ہے) صاحب عالی۔
عادل: (آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے۔) کیوں؟
کنیز: رات بھیگ چکی ہے۔ چل کر آرام فرمائیے۔
عادل: تم جاؤ ــــ میں جب طبیعت چاہے گی جا کر سو جاؤں گا۔
کنیز: آقا کا حکم ہے۔ کہ آپ کے سو جانے کے بعد میں ــــ
عادل: بابا ناحق میرے لیے اتنے تکلفات کرتے ہیں۔
کنیز: میں ان کے حکم کی پابند ہوں۔ آپ کو ابھی دوائی بھی کھانا ہے۔ اور دودھ بھی پینا ہے۔
عادل: یہ بھی بابا کا حکم ہے۔
کنیز: جی ہاں۔
عادل: (گہری سانس لے کر بربط ایک طرف رکھ دیتا ہے) مجھے اس وقت نیند آ رہی ہے۔ نہ کھانے پینے کی طلب ہے۔ میں کچھ دیر اور اس طلسماتی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔
کنیز: آپ ابھی کمزور ہیں۔ ہوا میں خنکی بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو زخم کی تکلیف بڑھ جائے۔ آقا اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دیں گے۔
عادل: بابا کتنے اچھے، کتنے ہمدرد اور کتنے مخلص ہیں۔
کنیز: وہ آپ کو مہمان نہیں۔ اس گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔ اسی لیے تو آپ کے لیے اتنا پریشان رہتے ہیں۔
عادل: یہ ان کی نوازش ہے (سر جھکا کر آہستگی سے) اس گھر میں ایک بابا یا پھر تم ــــ (مسکرانے لگتا ہے) جو میرے لیے پریشان رہتے ہو۔
کنیز: (اٹھلا کر) صرف میں اور آقا؟ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں (دادا کے ساتھ) ہو سکتا ہے۔ آپ کے لیے کوئی اور ہم سے بھی زیادہ پریشان ہو۔
عادل: (حیرت سے کنیز کو دیکھتا ہے) سالونی۔

کینز: (شوخ نگاہی سے) جی۔

عادل: یہ تم نے کیا کہا ـــــ اور ـــــ اور کون ـــــ میرے لیے پریشان ہو سکتا ہے ـــــ یہ خوش فہمی ـــــ

کینز: سانولی بچہ نہیں صاحب ـــــ پریشانیوں کو آنکھوں میں پڑھ لیتی ہے (فخر سے) میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ (مسکرانے لگتی ہے)

عادل: (اسے چند لمحے دیکھتا رہتا ہے ـــــ پھر بشاشت سے) کیا جانتی ہو۔ کیا مجھے نہ بتاؤ گی۔

کینز: یہی کہ کوئی آپ کے لیے سراپا پریشانی بنا رہتا ہے۔

عادل: (دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے) کون ہے وہ ـــــ!

کینز: (شوخی سے) مجھ سے نہیں اپنے دل سے پوچھئے صاحب ـــــ

عادل: (اٹھ کر قدم اٹھانے لگتا ہے) دل نے امیدوں کے سہارے کوئی ایسا نام چن لیا ـــــ جسے پریشانی تو کیا احساس بھی نہ ہوا ـــــ تو ـــــ

کینز: (مسکرا کر) صادق جذبے غلط نقطوں کے گرد نہیں گھومتے ـــــ میں مہینہ بھر سے آپ کے خیالات وجذبات کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ آپ عشق کے منازل انتہائی سرعت سے طے کر چکے ہیں۔ تو بے جا نہ ہوگا ـــــ کچھ ایسی ہی کیفیت دوسری جانب بھی ہے۔

عادل: (اس کے سامنے آکر) تو کیا میں بے دھڑک ماہ رخ کا نام لے سکتا ہوں۔

کینز: (مسکراتے ہوئے) میں نے کہا نا صادق جذبے غلط نقطوں کے گرد نہیں گھومتے ـــــ

عادل: تو کیا ـــــ تو کیا ہ ـــــ سانولی ـــــ میں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں۔۔ کہیں ـــــ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اتنے دنوں ـــــ

کینز: میں آپ کے جذبات کی گہرائیوں کا مطالعہ کر رہی تھی ـــــ

عادل: میں نے ماہ رخ کو چند لمحوں کے لیے دیکھا ہے سانولی ـــــ لیکن چند لمحوں کی ہلچل میری پوری زندگی پر چھا چکی ہے ـــــ میں اپنے دل کی آواز کو کیوں کر ماہ رخ تک پہنچاؤں۔

کنیز: آواز میں صدق ہو تو خود بخود فاصلوں کا سفر طے کر لیتی ہے۔ آپ کے بربط کی لَے ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر صاحب زادی صاحبہ تک پہنچ رہی ہے ـــــ بے فکر رہیئے ـــــ جب تک بربط سے نغمے پھوٹتے رہتے ہیں وہ محویت کے عالم میں ستون کے سہارے کھڑی ان نغموں کا درد اپنے دل میں بساتی رہتی ہیں۔

عادل: کہیں تم مجھے بنا تو نہیں رہیں۔

کنیز: ایسی جرأت کی مرتکب ہونے کی مجھے جرأت نہیں۔ آج آپ بربط بجاتے ہوئے اتنے بے چین تھے۔ کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ـــــ شاید میں نے وہ بات کہہ دی ہے جو مجھے نہ کہنا چاہیئے تھی۔

عادل: میں تمہارا احسان مند ہوں سانولی ـــــ (اظہارِ تشکر سے آواز کانپ جاتی ہے ـــــ) تم نے مجھے روشنی کی کرن دکھا کر راستوں پر بھٹکنے سے بچا لیا ـــــ

کنیز: میں محبت کی عظمت سے آگاہ ہوں صاحبِ عالی ـــــ میں آپ کو نہ بھی بتاتی ـــــ تو بھی آپ کے صادق جذبے آپ کی رہنمائی کر دیتے۔

عادل: تم کتنی ذی فہم ہو۔

کنیز: شکریہ۔

عادل: سانولی۔

کنیز: جی۔

عادل: میں اب صحت یاب ہو رہا ہوں۔

کنیز: خوشی کی بات ہے۔

عادل: لیکن میرے لیے معاملہ برعکس ہے۔ میں ٹھیک ہو گیا۔ تو پھر —— یہاں سے چلے جانا یقینی ہے —— کیا اپنے مرکز سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے سے پہلے میں ماہ رخ سے مل سکتا ہوں۔ ایک بار۔ صرف ایک بار سانولی —— جہاں اتنا احسان کیا ہے وہاں ——

کنیز: (سوچ میں پڑ جاتی ہے) یہ تو ——

عادل: دیکھو سانولی —— میری تمنا حق بجانب نہ سہی —— پھر بھی —— تمنا تو ہے ——

کنیز: (قدرے رک کر) میں آپ کے جذبات سے آگاہ ہوں —— تمنا کی شدت کا اندازہ بھی کر سکتی ہوں —— لیکن —— یہ اتنا بڑا کام ——

عادل: خدا کے لیے سانولی مجھے مایوس نہ کرو۔

کنیز: (سوچتے ہوئے) آپ یہ قدم خود ہی کیوں نہیں اٹھاتے۔

عادل: میں؟ کیسے؟ کیوں کر ——

کنیز: (آہستگی سے) ہر شام جب سورج ڈوب جاتا ہے، صاحبزادی صاحبہ اپنے بھائی کی قبر پر دیے جلانے جاتی ہیں۔ وہ سامنے —— وہ درختوں کے جھنڈ کے پار —— بارہ دری کے عقب میں جو عمارت نظر آ رہی ہے نا۔ وہی قبر ہے —— ہر شام وہاں جاتی ہیں ——

عادل: تو پھر؟

کنیز: آپ بڑے سادہ لوح ہیں (ہنستی ہے) میں نے صاحب زادی صاحبہ کے معمول سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ راستہ بھی بتا دیا ہے —— راستے کہیں بھی آپس میں مل سکتے ہیں۔

عادل: (مسرور ہو کر) اوہ سانولی —— تم کتنی ذہین ہو۔

کنیز: شکریہ —— اچھا تو آپ اب باتیں چھوڑیے۔ اندر تشریف لے چلیے۔

عادل: نہیں ——

کنیز: کیوں؟

عادل: آج رات بھر میں اس فسوں خیز فضا میں بربط کے تاروں کے واسطہ سے اپنا حالِ دل کہتا رہوں گا۔ سانولی آج میں رات بھر بربط بجاؤں گا۔ میری انگلیاں شل ہو جائیں۔ تو بھی بجاتا رہوں گا۔

کنیز: (مسکرا کر) کیوں صاحب زادی صاحبہ کو رات بھر جگائے رکھنا چاہتے ہیں۔

عادل: (جھوم کر) جاگیں تمام رات جاگیں تمام رات (بربط تھام لیتا ہے)

کنیز: تو واقعی نہیں جائیں گے آپ۔

عادل: تم جا سکتی ہو۔

کنیز: لیکن آقا ——

عادل: بابا سے کہہ دینا۔ کہ تمھیں میں نے سبک دوش کیا ہے۔

کنیز: (مسکراتی ہے) خدا حافظ ——

عادل: خدا حافظ۔

(کنیز چلی جاتی ہے۔ عادل بربط کے تاروں کو چھیڑنے لگتا ہے۔ نغمے فضا میں بکھرنے لگتے ہیں —— چاندنی اور خوشبوؤں کا غبار اور گہرا ہو جاتا ہے)

(رات کسی نئی نویلی دلہن کی مانگ کے سندور کی طرح چمک رہی ہے ستاروں کی آنکھوں میں خواب لہرا رہے ہیں ۔ فضا میں نور کی بارش ہے ۔ چمن آسودگی کی آغوش میں مچل رہا ہے ۔ پھول ، پودے ، بیلیں الھڑ پنے سے لہرا رہے ہیں ۔ ایک پرانے درخت سے ٹیک لگائے ماہ رخ حسن مجسم بنی کھڑی ہے ۔ چاندنی اور اندھیروں کی آنکھ مچولی حسین ہے ۔ قریب ہی درخت کی بوڑھی لٹ تھامے عادل برق پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے ——)

عادل : (مخمور آواز میں) ماہ رخ ۔

ماہ رخ : (شرمگین ادا سے) جی ۔

عادل : سوچتا ہوں ۔ کہیں خوشیوں کے اس والہانہ التفات سے میں پاگل نہ ہو جاؤں ۔

ماہ رخ : (اک نگاہ دلنواز اس پر ڈالتے ہوئے) انسان غموں اور خوشیوں کی انتہا سہہ جانے کا عادی ہے ۔ خاطر جمع رکھیئے پاگل نہیں ہونگے آپ ۔

عادل : (پیار سے) مجھ سے تو خوشی کی انتہا برداشت نہیں ہو سکتی ۔ غم سہہ جانے کے تو خیال ہی سے روح لرز اٹھتی ۔

ماہ رخ : (مسکراتے ہوئے) غم کا تصور روح فرسا ضرور ہوتا ہے ۔ لیکن جب یہ ٹوٹ پڑتا ہے تو انسان انتہائی سخت جانی سے اسے جھیل جاتا ہے (اداس ہو کر)

میری طرف دیکھئے ـــــ بابا کو دیکھئے ہم بھی تو شجاع کی جدائی کا غم جھیل گئے ہیں۔ (آہ بھر کر) میں نے تو شجاع کے یوں بچھڑ جانے کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں کیا تھا ـــــ (درد سے مسکراتے ہوئے) لیکن دیکھ لیں۔ اس کے بچھڑ جانے پر بھی زندہ ہوں ـــــ

عادل: بچھڑنا کتنا اذیت دہ ہے ماہ رخ ـــــ کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ احساس جاگتا ہے۔ تو مجھے اپنا دماغ مفلوج ہوتا محسوس ہوتا ہے ماہ رخ تم نے مجھ پر جو جادو کر دیا ہے ـــــ تم سے بچھڑ کر میں تو زندہ رہنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔

ماہ رخ: کوئی اور بات کیجئے عادل ـــــ یہ تکلیف دہ ـــــ

عادل: (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) ماہ رخ ـــــ کہیں ہم دونوں بچھڑ تو نہ جائیں گے۔

ماہ رخ: (گھبرا کر) آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں عادل ـــــ

عادل: (اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے) بعض اوقات یہ حقیقت انگارے کی طرح ذہن سے چپک جاتی ہے۔ کہ میں اب صحت یاب ہو گیا ہوں ـــــ اور مجھے یہاں سے چلے جانا ہے ـــــ

ماہ رخ: (بے چین ہو کر) یوں نہ کہئے ـــــ آپ یہاں سے نہیں جا سکتے۔ (اس کا بازو تھام لیتی ہے) بابا آپ کو کبھی جانے نہ دیں گے۔ ابھی تو آپ نے بابا سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے ـــــ بابا تو اسی آس پر جی رہے ہیں۔ کہ آپ ان کے بیٹے کے لہو کا انتقام لیں گے۔ ان کی سلگتی خواہش کو پورا کریں گے ـــــ کیا آپ اپنا وعدہ بھول گئے۔

عادل: (پُرعزم لہجے میں) میں اپنا وعدہ نہیں بھول سکتا ماہ رخ۔

ماہ رخ: (خوشی سے) تو پھر اس بے جا وسوسے کو کیوں ذہن نشین کیے ہوئے ہیں۔ اس آوارہ سوچ کو ذہن سے جھٹک دیجئے ـــــ آپ کو یہیں

رہنا ہے سمجھے۔ یہیں رہنا ہے۔

عادل: (جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) ماہ رخ تم مجھے نئی زندگی عطا کر رہی ہو ـــــ میں اب کوئی وسوسہ، کوئی خدشہ اپنے پاس پھٹکنے نہیں دوں گا ـــــ مجھے کوئی ڈر نہیں ـــــ

ماہ رخ: (ادائے دلربائی سے) کیا آپ اتنے بزدل ہیں۔ کہ ڈرنے کی نوبت آگئی۔

عادل: میں ـــــ؟ میں بزدل نہیں ہوں ماہ رخ ـــــ میں کتنا بہادر، کتنا نڈر اور کتنا جری انسان ہوں ـــــ وقت تمہیں بتائے گا ـــــ

ماہ رخ: (ادائے دلبری سے) وقت نے تو ابھی یہی بتایا ہے کہ عورتوں کے تیروں سے زخمی ہو جاتے ہیں ـــــ

عادل: اسے اگر تم میری بزدلی سے تعبیر کرتی ہو ـــــ تو اس بزدلی پر میں نازاں ہوں ـــــ

ماہ رخ: اوہ ہو ـــــ اصول ایک ہونا چاہیئے ـــــ اس کی تفسیر موقع محل سے بدل نہ جانی چاہیئے ـــــ

عادل: میری زندگی بدل چکی ہے۔ میں اصول کے بدلنے کو کیا دیکھوں۔ ماہ رخ یہ حسین حادثہ نہ پیش آتا ـــــ تو میری زندگی کتنی نامکمل ـــــ کتنی ویران اور کتنی ناآسودہ ہوتی ـــــ اس تیر نے میری زندگی کا جمود توڑ دیا ہے ـــــ مجھے زندگی کے ولولوں، امنگوں اور چاہتوں کا حسن دیا ہے ـــــ مجھے اپنے آپ سے آگہی بخشی ہے۔

ماہ رخ: (مسکراتی ہے) بس بس ـــــ اتنی شاعری نہ فرمایئے۔ آیئے اس ندی تک چلیں ـــــ نور کی چادر سی بہتی لگ رہی ہے چاندنی ہیں۔

عادل: (جذبات سے بھرپور آواز میں) نور و رنگ کا سیلاب تو سمٹ کر میرے پہلو میں آگیا ہے ـــــ میری نگاہوں میں کوئی جلوہ کوئی منظر ـــــ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

ماہ رخ: (سمٹ کر اس کے بازو سے بچنے کے لیے قدم اٹھاتی ہے) آیئے ادھر چلتے ہیں ـــــ آپ کا بربط کہاں ہے ـــــ لائے نہیں آج؟

عادل: (جھک کر بربط اٹھاتے ہوئے) یہ تو میرے ساتھ ہمیشہ رہے گا ماہ رخ ـــــ یہ مجھے کتنا عزیز ہے تم کیا جانو ـــــ پتہ ہے کیوں عزیز ہے مجھے۔؟

ماہ رخ: (شوخی سے) میں کیا جانوں؟

عادل: یہ میرے دل کی آواز ـــــ میری روح کے سوز کو میرے محبوب تک پہنچانے کا وسیلہ بنا ـــــ

ماہ رخ: اوں ہوں ـــــ

عادل: (تار چھیڑتے ہوئے ماہ رخ کی طرف جھک کر) انکار کر سکتی ہو؟ کیا رات رات بھر اس کے پُرسوز نغمے تمھارے دل میں ہلچل نہیں مچاتے رہے ـــــ کیا اس سے پھوٹتے سر تمھیں بے تاب نہیں کرتے رہے۔۔ تم مجھ تک پہنچنے کو مچلتی نہیں رہیں ـــــ

ماہ رخ: (شوخی سے) بالکل بھی نہیں ـــــ

عادل: (شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے) تو پھر کیسے تم مجھ تک آ پہنچیں ـــــ یہ درد یہ سوز تمھیں کھینچ نہیں لایا۔

ماہ رخ: وہ تو آپ نے اس دن زبردستی میرا راستہ روک لیا۔ ورنہ میں۔

عادل: سانولی کو دعا دیتا ہوں جس نے راستے کا اشارہ دے دیا۔

ماہ رخ: اچھا تو اس آفت کی پرکالہ نے آپ کو یہ راستہ دکھایا۔

عادل: (بے خودی سے) وہ نہ بھی بتاتی۔ تو میرے جذبے راستے خود تلاش کر لیتے ماہ رخ ـــــ اب تو مجھ میں صبر کا یارا نہیں رہا تھا ـــــ مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ـــــ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ (اٹھلا کر) اب حال کیسا ہے؟

عادل: شاید مجھ سا خوش نصیب انسان دنیا میں کوئی ہوگا ــــ (ماہ رخ کو بازو میں تھام کر ــــ) تم میرے لیے کیا ہو ماہ رخ ــــ زندگی بھر بھی کہتا رہوں ــــ تو شاید اپنا مطلب بیان نہ کر سکوں ــــ یہ نہ بتلا سکوں۔ کہ تم میرے لیے کیا ہو ــــ

ماہ رخ: (قدم اٹھا کر) آیئے ــــ کوئی اور باتیں کریں۔ (ادائے دلفریبی سے مسکرا کر) آپ تو شاعری پہ اتر آئے۔ کوئی اور باتیں کریں۔

عادل: (اس کے ساتھ چلتے ہوئے) نہیں ــــ میں تمہاری قربت کے ان حسین لمحوں کو ایسی ویسی باتوں کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔

ماہ رخ: (سرشار لہجے میں) تو پھر کن باتوں کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔

عادل: (بدمست لہجے میں) صرف دلوں کی دھڑکنیں سننے اور سنانے میں یہ وقت صرف کرنا چاہتا ہوں۔ آؤ۔ ندی کنارے میں بربط بجاؤں گا۔ تم اپنی آواز کا جادو جگانا ــــ

ماہ رخ: آپ بربط بجایئے گا۔ اور میں بہتی ندی میں لرزتے ستاروں کا عکس دیکھوں گی۔ بربط سے پھوٹتے نغموں کی زبان خاموشی سے سمجھنے کی کوشش کروں گی۔

عادل: بڑی ذہین ہو۔

ماہ رخ: کیوں؟

عادل: کس خوبصورتی سے گانے سے انکار کر دیا۔ تمہاری ذہانت قابل داد ہے۔

ماہ رخ: (مسکرا کر) آپ بھی ضرورت سے زیادہ ہی سمجھدار ہیں۔ ذہانت کو سمجھنے کے لیے بھی ذہانت کی ضرورت ہے ــــ

عادل: آؤ چلیں ــــ موسم آج دلفریبی اور نشے سے چُور چُور ہے۔

ماہ رخ: (شائستگی سے اپنا ہاتھ بڑھا دیتی ہے) چلیئے۔

عادل: (اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر) ماہ رخ وعدہ کرو ــــ کہ یہ ہاتھ مجھ

سے کبھی نہیں چھوٹے گا ـــــ یہ میرا اور بالکل میرا ہے۔

ماہ رخ: (اس کے کندھے پر جھکتے ہوئے) جسم وجان کوئی چیز نہیں عادل ــــ ماہ رخ کی تو روح بھی آپ کی ہے۔

عادل: (جذبات سے سرشار ہو کر ہاتھ پر گرفت مضبوط کر کے لرزتی آواز میں)

ماہ ــــ رُخ ــــ میری ماہ رخ ــــ

(دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے شانہ بہ شانہ چلتے ہیں۔ مدہوش بے خود گرد و پیش سے بے نیاز سے لگتے ہیں۔)

(شام کہساروں سے پھسلتی ہوئی میدانوں میں رات کا روپ دھار رہی ہے۔ عادل اپنے کمرۂ نشست میں ایک مسند پر بیٹھا ہے اس کا بربط اس کے قریب پڑا ہے۔ وہ اس کا اک اکھڑا تار مرمت کر رہا ہے کمرے میں شمعیں جلا دی گئی ہیں۔ لیکن ابھی شام کی ڈوبتی روشنی بھی کھڑکی سے اندر آ رہی ہے ـــــ دروازے کا پردہ اٹھا کر مراد اندر آتا ہے۔ اس کے کپڑے خاک آلود ہیں اور چہرے پر تکان کے آثار ہیں۔)

عادل: (سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے) آ گئے۔ اتنی دیر لگا دی۔

مراد: (جھنجھلا کر) دیر سویر سے تمھیں کیا۔ تم اپنا بربط درست کرو۔ کہ شام ڈھل چکی ہے اور رات قریب آ رہی ہے۔

عادل: (بربط الگ رکھ کر) بہت غصے میں ہو دوست۔

مراد: (مسند کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے جوتے اتارتا ہے) عادل ہمیں یہاں آئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔

عادل: تو پھر ـــــ

مراد: مجھے بار بار تمھیں یاد دلانا پڑے گا۔ کہ ہم اک مقصد کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ صرف محبت کے چکر چلانے نہیں آئے۔

عادل: میری محبت ـــــ

مراد: (جوتے اتارنے کے بعد کمر کی پٹی کھولتے ہوئے بات کاٹ کر) میں نے تم سے کہا تھا۔ کہ تمھاری محبت ہمارے کام میں حارج ہوئی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔

عادل: تم نے کیسے فیصلہ کر لیا۔ کہ میری محبت ہمارے کام میں حارج ہو رہی ہے۔

مراد: رات تم آستانۂ عشق پر سر جھکائے اور دن! رات کی تیاری میں گزار رہے ہو۔ اب تم بالکل تندرست ہو۔ کمزوری مانع نہیں ہونی چاہیئے۔

عادل: (مسکرا کر) تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

مراد: جو آوارہ گردی میں کرتا پھرتا ہوں۔

عادل: (دل جمعی سے) کتنا مواد اکٹھا کیا۔؟

مراد: میں اکیلا جتنا کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔

عادل: (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر) اگر میں یہ کہوں کہ میں نے تم سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ کام کر لیا ہے تو پھر ——!

مراد: پھر میں یقین نہیں کروں گا۔ گھر میں بیٹھے تمھیں ——

عادل: (مسکرا کر) اس گھر کی اہمیت تم بھول گئے کیا۔ مراد —— میں نے سارا کام مکمل بھی کر لیا ہے۔

مراد: (حیران ہو کر) یقین کر لوں؟

عادل: تمھیں یقین کرنا پڑے گا۔

مراد: کیا کیا ہے؟

عادل: (ادھر ادھر دیکھ کر) ہم کمرے میں اکیلے ہیں نا —— پہلے تسلی کر لو۔

مراد: (اٹھ کر پردے ہٹا ہٹا کر اطمینان حاصل کرتا ہے —— پھر عادل کے قریب بیٹھ کر) ہوں کوئی نہیں ہے۔ کہو اب —— کیا معرکہ مار چکے۔

عادل: بابا سے میں نے بہت ہی اہم معلومات حاصل کر لی ہیں۔ بابا نے مجھے نقشے دکھائے ہیں، ریاست کے خفیہ نقشے —— فوجی اہمیت

کی باتیں۔ فوج کی تعداد۔ اسلحے کے ذخائر —— بہت سی دستاویزیں۔۔

مراد: (جلدی سے) کیا واقعی؟

عادل: ہاں مراد —— اب تو بابا کے دارالمطالعہ کی چابیاں بھی میرے پاس ہی رہتی ہیں۔ وہ مجھ پر اس حد تک اعتماد کر چکے ہیں۔ وہاں بابا کے بیشمار خفیہ کاغذات ہیں۔

مراد: بہت خوب ——

عادل: میں ساری دستاویزات کی نقول تیار کر رہا ہوں —— فوجی اہمیت کے راز لکھ رہا ہوں —— بابا نے یہ بھی بتایا ہے کہ ابوالحسن تانا شاہ سیواجی مرہٹہ کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ یہ مرہٹہ سبزوار مغلوں کے لیے دردسر بنا ہوا ہے۔

مراد: سب سے نپٹ لیا جائے گا۔

عادل: ریاست کے ہندو وزیر مدنا کی سازش ہے۔ جو وہ ان کی پشت پناہی کر رہا ہے۔

مراد: بیجاپور کو تو سزا مل چکی —— اب گولکنڈہ کی باری ہے۔ یہاں بھی ویسی ہی سازشیں ہیں —— میں گھوم پھر کر کافی معلومات اکٹھی کر چکا ہوں۔ مدنا اور قطب شاہ کا انجام بیجاپور کے —— خاں اور سکندر عادل شاہ سے بھی برا ہوگا۔

عادل: ہونا چاہیئے۔ قطب شاہ کی خون میں لت پت لاش دیکھنے کی بابا کو تڑپ ہے اور ہم بابا سے اس بات کا وعدہ بھی کر چکے ہیں۔

مراد: ایک بات ہے عادل۔

عادل: کیا؟

مراد: بابا ہم پر اعتماد ضرور کر رہے ہیں۔ لیکن وہ محب وطن ماننا پڑے گا۔ کہ ضرور ہیں۔

عادل: ہاں ——

مراد: اگر انہیں پتہ چل جائے کہ ہم دونوں مغل حکومت کے جاسوس ہیں تو ——

عادل: یقیناً سر قلم کر دیں (ہنستا ہے) جس مہم کو سر کر رہے ہیں، اس میں یہ خطرات شامل ہیں۔ (قدرے سنجیدہ ہو کر) ایک بات کہوں مراد۔

مراد: کہو ——

عادل: کبھی کبھی میرا ضمیر مجھے بے طرح ملامت کرنے لگتا ہے۔ میں بابا کے اعتماد کو دھوکا دے رہا ہوں —— یہ خیال سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ کسی کے خلوص و مروت کو دھوکہ دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔

مراد: ملک و ملت کے مفاد کے لیے یہ دھوکا جائز ہے۔

عادل: لیکن ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہونا بڑا مشکل ہے مراد ——

مراد: ایسی باتیں نہ سوچو۔

عادل: دل چاہتا ہے بابا کو اپنے مقصد سے آگاہ کر دوں —— ہو سکتا ہے وہ ہمارے اس سے بھی زیادہ کام آجائیں، وہ بھی تو والی کے دل دشمن ہیں۔

مراد: (گھور کر دیکھتے ہوئے) تمھارا دماغ چل تو نہیں گیا۔ کہیں ضمیر کے ہتھے چڑھ کر ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا —— یوں بھی تم اس خاندان سے دلی ناطے جوڑ چکے ہو —— کہیں جذبات میں بہک نہ جانا ——

عادل: نصیحت کا شکریہ۔ شاید اب تک میرا ضمیر مجھے اظہار پر مجبور کر چکا ہوتا۔ لیکن ایک بات سے تسلی ہو جاتی ہے۔ کہ بابا اور ماہ رخ دونوں قطب شاہ کی تباہی کے متمنی ہیں۔

مراد: اور وہ اگر رہے گی —— (اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) ہاں عادل —— کچھ اندازہ ہے کہ اور کتنے دنوں کا کام باقی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ دستاویزوں اور نقشوں کی نقول میں کتنا وقت اور لگے گا۔

عادل: چھ سات دن اور —— نقشے تمھیں آج ہی دے سکتا ہوں۔

مراد: ٹھیک ——— تم یہ کام کرو۔ میں نقشوں کی مدد سے جگہوں کا تعین کر لوں گا ——— خفیہ راستوں تک پہنچنے کی کوشش کروں گا ——— میں نے گھوم پھر کر دیکھا ہے ——— کہ یہاں انتظامیہ بھی لاپرواہ ہے۔

عادل: حکمران کی عیاشی کا اثر ہے۔ اپنے دورِ حکومت کے ان سالوں میں وہ ایک بار بھی حیدر آباد سے باہر نہیں آیا۔

مراد: ہماری افواج کی ایک ہی یلغار کافی ہو گی۔

عادل: انشاءاللہ۔

مراد: محتاط رہنے کی بیحد ضرورت ہے عادل ——— میں تمہیں ایک بار پھر نصیحت کرتا ہوں۔

عادل: شکریہ ——— (ہنستے ہوئے) اب تو میں اپنا بربط درست کر سکتا ہوں نا۔

مراد: ضرور ——— ضرور ——— تم نے دل خوش کر دیا۔

(عادل بربط اٹھا لیتا ہے۔ مراد کپڑے بدلنے کے لیے پردے کے پیچھے چلا جاتا ہے)

(ایک سادہ سی مسند پر بابا بیٹھے ہیں ۔ ہیچوان کی نے ہونٹوں میں دبائے وہ کسی سوچ میں مستغرق ہیں ۔ کمرہ سادگی سے آراستہ ہے بابا کا لباس بھی انتہائی سادہ لیکن باوقار ہے ـــــ دن زوال پذیر ہے کمرے میں لرزتی کانپتی روشنی بکھر رہی ہے ـــــ آہٹ پر بابا چونک کر دیکھتے ہیں ۔ افشاں احترام سے سر جھکائے اندر آتی ہے)۔

بابا : آؤ بیٹی ۔ بیٹھو ـــــ

افشاں : (بیٹھتے ہوئے دوپٹہ سر پر ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے) آپ نے یاد فرمایا تھا بابا ـــــ

بابا : ہاں ۔

افشاں : فرمایئے ۔

بابا : تم اطمینان سے بیٹھو ـــــ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں ۔

افشاں : جی ؟

بابا : (ہیچواں ایک طرف کرتے ہوئے مسکرا کر) تم گھبرا کیوں گئیں ۔ اطمینان رکھو۔ کوئی بری خبر تمھاری منتظر نہیں ۔

افشاں : (سر قدرے جھکاتے ہوئے) میں واقعی ڈر گئی تھی بابا ۔

بابا : (کچھ سوچتے ہوئے) مجھے تمھاری وساطت سے ماہ رخ کا عندیہ معلوم

کرتا ہے۔

افشاں: جی بابا؟

بابا: (گہری سانس چھوڑتے ہوئے) ماہ رُخ کی ماں حیات نہیں۔ اور نہ ہی اپنے اردگرد مجھے کوئی اور مدبر عورت نظر آتی ہے۔ تم ماہ رخ کی بہن بھی ہو اور دوست بھی —— تم پر ہی میری نظر رکتی ہے —— تم زیادہ اچھی طرح اس کو سمجھ سکتی ہو۔

افشاں: آپ کس بارہ میں کہنا چاہ رہے ہیں بابا۔

بابا: میں ماہ رخ کی شادی کے متعلق سوچ رہا ہوں بیٹی —— جوان بیٹی کا بار ہے کندھوں پر —— چاہتا ہوں جیتے جی اتار دوں ——

افشاں: (سر جھکا کر) آپ ماہ رخ کی مرضی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

بابا: مرضی نہیں —— میں اپنے انتخاب کی اس سے توثیق کروانا چاہتا ہوں۔

افشاں: آپ کا انتخاب؟

بابا: عادل۔

افشاں: (خوشی و مسرت سے دونوں ہاتھ اٹھا لیتی ہے) بابا ——!

بابا: (خلاؤں میں دیکھتے ہوئے) عادل، خوب رُو، بہادر اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نبرد آزما ہونے والا جوان ہے۔ مجھے بیحد پسند ہے جہاں تک میرے تجربے اور سوچ بچار کا تعلق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ عادل اس رشتے کا خواہاں ہے۔ گو وہ کھل کر کبھی بات نہیں کر پایا لیکن شائستگی اور شرافت سے ہمیشہ یہی تاثر دیا ہے۔ کہ اس گھر کو اپنا کر اسے دنیا میں جنت مل جائے گی۔ وہ بہت سلجھا ہوا انسان ہے۔ اس کا کردار صیقل ہے۔ وہ بیجاپور کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا باپ زندہ ہے نہ ماں۔ اور اب تو بیجاپور بھی سلطنت دہلی کے الحاق کی وجہ سے اس سے چھوٹ چکا ہے —— اسے یہیں

رہنا ہے۔ یہیں رہنا پڑے گا ——

افشاں: (مؤدبانہ سب باتیں سنتی ہے) ہاں بابا۔

بابا: تم نے ماہ رخ کا عندیہ معلوم کرنا ہے۔ ہمارے انتخاب کو وہ یقیناً قبول کرلے گی۔ پھر بھی اس کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔ تم دو چار دن تک ہمیں اس کے خیالات سے آگاہ کردو۔

افشاں: (خوشی سے) بہت اچھا بابا —— ماہ رخ کو بھلا اعتراض کیوں ہونے لگا۔ میں آپ کو مطلع کردوں گی —— کتنی خوشی کی بات ہے بابا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔

بابا: پہلے بہن سے پوچھ تو لو —— پھر خوشیاں منانا۔

افشاں: آپ بے فکر رہیں بابا ——

بابا: تو پھر دو چار دن تک مجھے بتلا دو گی نا ——

افشاں: میں آج ہی —— (کچھ سوچ کر چپ ہو جاتی ہے —— پھر خوشی پر قابو پاتے ہوئے) ہاں بابا —— میں آپ کو بتلا دوں گی۔

بابا: (پیچواں منہ سے لگاتے ہوئے) یہ بات خوش اسلوبی سے طے ہو جائے تو میرے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا —— پھر —— پھر میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے جان بھی لڑا دوں گا —— اپنے شجاع کا انتقام لے سکوں گا —— اپنے بچے کے خون کا انتقام۔

افشاں: (بابا کے جوشیلے تیور دیکھتے ہوئے) بس میں جاؤں بابا —— جاؤں نا؟

بابا: بہت جلدی میں ہو —— بہت مسرور دکھائی دیتی ہو۔

افشاں: (اٹھ کر جاتے ہوئے) ہاں بابا —— خوشی کی بات تو ہے ہی ——

(پردہ اٹھا کر بھاگ جاتی ہے۔ بابا پیچواں کی نے ہونٹوں میں دبائے سوچوں میں گم ہو جاتا ہے) ——

(ماہ رخ ایک بیضوی آئینے کے سامنے اپنے حسنِ جہاں سوز کو محویت سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں کا مرکز اس کی اپنی آنکھیں ہیں بڑی بڑی کشادہ آنکھیں ـــــ جن میں جادو جاگ رہا ہے۔ اس کے کانوں میں عادل کے الفاظ اتر رہے ہیں ـــــ تمھاری آنکھوں کے سحر نے مجھے اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا ہے ماہ رخ۔ وہ اس آواز سے مدہوش سی ہوئی جا رہی ہے ـــــ کمرے میں افشاں آ جاتی ہے۔ ماہ رخ کی پشت پر کھڑے ہو کر وہ اس کی محویت سے محظوظ ہوتی ہے۔ شام رات کی آغوش میں غنودگی کے عالم میں ہے ـــــ افشاں سمجھ جاتی ہے۔ کہ ماہ رخ رات کے انتظار میں گھڑیوں کو یوں دھکیل رہی ہے ـــــ وہ دبے قدموں سے آگے بڑھتی ہے۔ اور چہرے پر قدرے ہراسانی اور گھبراہٹ کا تاثر پیدا کر لیتی ہے ـــــ)

افشاں: (خوف زدہ سی نظر آنے کی کوشش) ماہ رخ ـــــ

ماہ رخ: (اطمینان سے رخ پلٹ کر) کیوں؟

افشاں: (اسی انداز میں) ماہ رخ!

ماہ رخ: (گھبرا کر) کیوں کیا بات ہے افشاں۔

افشاں: تمھیں معلوم ہے۔ (چہرہ اور زیادہ افسردہ اور خوف زدہ بنا لیتی ہے)

تمھیں پتہ ہے ؟

ماہ رخ : کیا ؟

افشاں : بابا کو تمھارے اور عادل کے راتوں کو ملنے ـــــ کا پتہ چل گیا ہے ۔

ماہ رخ : (ایک دم حواس باختہ ہو کر) افشاں ـــــ سچ کہہ رہی ہو ۔

افشاں : تو اور کیا ـــــ بابا ایک دم اتنے غصے میں ہیں ۔ کہ تمھیں کیا بتاؤں ۔
ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے ـــــ وہ برس رہے ہیں ـــــ
بالکل خوفناک بادل کی طرح ۔

ماہ رخ : ہائے اللہ (زرد پڑ جاتی ہے)

افشاں : انہوں نے عادل اور تمھیں اس بات کی عبرت ناک سزا دینے کا ارادہ کر لیا ہے ۔

ماہ رخ : کیا ؟ کیا سزا ؟ ـــــ (دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان پکڑ لیتی ہے)
کیا سزا افشاں ۔

افشاں : شاید (آنکھیں پھیلاتے ہوئے) شاید عادل کو زندہ دیوار میں چنوا دیں ۔

ماہ رخ : نہیں ـــــ افشاں ـــــ بابا اتنے سنگ دل نہیں ـــــ

افشاں : بابا اسے اپنی عزت کا معاملہ سمجھ رہے ہیں ۔ اور تمھیں معلوم ہی ہے
انہیں اپنی عزت کتنی عزیز ہے ـــــ ایک ایسا اجنبی جس کے حسب
نسب کے متعلق کچھ علم ہی نہیں ۔ ان کی بیٹی پر ڈورے ڈالے ۔ بابا بھلا
یہ بات کیسے برداشت کرتے ہیں ـــــ (منہ پھیر کر ہنسی روکتے ہوئے)
اور کرنی بھی نہیں چاہئیے ـــــ

ماہ رخ : تم بھی بابا کی ہم نوا بن گئیں ۔

افشاں : مجھے بھی اپنے خاندان کی عزت عزیز ہے ۔

ماہ رخ : (آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھتی ہے) افشاں ـــــ

افشاں : ہوں ـــــ (ماہ رخ اسے دیکھتی ہے ۔ اس کے چہرے کے انداز

بدلنے لگتے ہیں۔ آنکھوں میں چمک آجاتی ہے)

ماہ رخ: میں نے محبت کی ہے۔ محبت جرم نہیں ——— گناہ نہیں۔ یہ سچائی کا ایسا راستہ ہے۔ جس پر انسان بے دھڑک آگے بڑھ سکتا ہے۔ محبت روشنی ہے نور ہے۔ اندھیرا نہیں کہ بھٹک جانے کا امکان ہو ——— مجھے اپنے عشق کا اعتراف ہے ——— میرا وجود اس مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ عورت کا وجود صدیوں سے اس مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ یہ چکر یہ گھماؤ کبھی ختم نہیں ہوتا افشاں۔ یہ عورت کی فطرت ہے۔ اور میں بھی اک عورت ہوں۔

(ماہ رخ متانت سے قدم اٹھاتی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ افشاں آنکھیں مٹکا مٹکا کر ہنسی دبا دبا کر اسے دیکھتی ہے)

ماہ رخ: (قدرے مڑ کر) بابا اگر اپنی عزت کے لیے قربانی دینا ہی چاہتے ہیں۔ تو ان کے ہاتھ مجھ پر اٹھ سکتے ہیں۔ وہ زندہ مجھے چنوا دیں۔ کہ انار کلیاں محبت کو دوام بخشنے کے لیے روایات کو شکست دے کر دیواروں میں چنی جاتی رہتی ہیں ———

افشاں: اوہو ——— عشق نے اس حد تک دیوانہ کر دیا۔ عادل کی جگہ اپنے کو پیش کر دیا۔

ماہ رخ: تم نہیں جانتیں عادل میرے لیے کیا ہے۔ اس کے لیے ایک کیا ماہ رخ، ہزار زندگیاں قربان کر سکتی ہے ———

(افشاں کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے ماہ رخ حیران ہو کر اسے دیکھتی ہے۔ پھر لپک کر اس کے قریب آتی ہے۔ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالتی ہے ———)

ماہ رخ: تمھیں کیا ہو رہا ہے ——— پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ بتاتی کیوں نہیں۔

افشاں: (پیار سے اس کی ٹھوڑی چھو کر) میں نے مذاق کیا تھا ماہ رخ۔

ماہ رخ: (ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹا کر منہ پھیر لیتی ہے) ایسا تلخ مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

افشاں: (اس کے سامنے آکر) اس لیے کہ جو شیریں خبریں تجھے سنانے والی تھی ـــــ اس کی مٹھاس اتنی زیادہ تھی۔ کہ ـــــ

ماہ رخ: عاجز کر دیا ہے تم نے ـــــ

افشاں: ماہ رخ آج بابا نے مجھے بلایا تھا۔

ماہ رخ: (اسی سنجیدگی سے) تو پھر۔

افشاں: بتاؤں کیا کہا تھا انہوں نے۔

ماہ رخ: ضرورت سمجھتی ہو تو بتا دو ـــــ ورنہ خیر۔

افشاں: تم تو ناراض ہو گئیں۔

ماہ رخ: نہیں۔

افشاں: تو پہلے ہنسو، مسکراؤ ـــــ پھر بتاؤں گی۔

ماہ رخ: (مسکراہٹ روکنے کی لاحاصل کوشش) تم بہت شریر ہوتی جا رہی ہو ـــــ

افشاں: بات ہی ایسی ہے۔

ماہ رخ: (جل کر) اب بک بھی چکو۔

افشاں: پہلے بتاؤ کیا انعام دو گی۔

ماہ رخ: تم ناحق میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔

افشاں: بابا عادل کو اپنی فرزندی میں ـــــ لینا چاہتے ہیں ـــــ کہو تمہیں منظور ہے۔

ماہ رخ: (چہرہ حیا کی سرخی سے چمک اٹھتا ہے) باتونی کہیں کی۔

افشاں: اللہ قسم! سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا تمہارا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اب چپ کیوں ہو گئیں ـــــ اوہو شرمانے لگیں۔

ماہ رخ: ہٹو بھی۔

افشاں: تو بابا سے کہہ دوں تمھیں یہ رشتہ پسند نہیں (مسکراتی ہے)

ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے شرمگین ادا سے) اگر تم چاہتی ہو کہ ماہ رخ حیات سے اپنا ناطہ توڑ لے۔ تو بے شک بابا سے یہی کہہ دو۔

افشاں: (کمر پر ہاتھ رکھ کر) ہائے ہائے ——— کتنی بے باک ہو گئی ہے یہ لڑکی۔

ماہ رخ: (اسے دھکے دے کر کمرے سے نکالتے ہوئے۔ اب جاتی بھی ہو یا نہیں:

افشاں: (واپس لوٹتے ہوئے) نہیں جاتی ——— آج تو میں جونک کی طرح تمہارے ساتھ چمٹی رہوں گی۔ ساری رات ——— عادل بربط بجا بجا کر خود ہی تھک ہار کر واپس چلا جائے گا ——— میں تمہیں نہیں جانے دوں گی آج ——— سمجھیں ———

ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے) پانی ہر رکاوٹ کے باوجود بہاؤ کی طرف بہنے سے نہیں رکتا افشاں صاحبہ۔

(افشاں ہنسنے لگتی ہے ——— ماہ رخ کی مسکراہٹ بھی گہری اور پر فسوں ہو جاتی ہے۔)

(بیرونی جھروکے میں عادل کھڑا ہے۔ وہ اتنا الجھا اتنا پریشان ہے کہ دیکھنے والے کو اس پر ترس آنے لگے۔ ہوائیں آوارہ سی ہیں۔ بادل کے ٹکڑے نیلے آسمان کی آغوش میں ضدی بچوں کی طرح مچل رہے ہیں ـــــــ مراد اس طرف آتا ہے۔ وہ باہر جانے کو تیار ہے۔ اپنے لباس کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے ادھر آتا ہے۔ عادل کو یوں مغموم دیکھ کر وہ بھی چند لمحے خاموش رہتا ہے ـــــــ عادل اس کی طرف دیکھتا ہے ـــــــ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ دوبارہ باہر دیکھنے لگتا ہے۔)

مراد: (اپنی کمر کے گرد لپٹی پٹی میں تلوار کا سرا درست کرتے ہوئے) عادل۔

عادل: ہوں۔

مراد: اس طرح تو کچھ نہیں بنے گا۔

عادل: (بے بسی سے) تو میں کیا کروں مراد ـــــــ میں سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ پھندہ میرے گلے کے گرد اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ اب آواز بھی نہیں نکل پاتی ـــــــ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

مراد: میں نے تو روزِ اوّل ہی کہا تھا۔ عشق وشق کا چکر راس نہیں آنے کا ـــــــ تم نے میری سنی ہی نہیں آنکھیں بند کر کے آگ کے سمندر میں کود گئے۔

عادل: (بیچارگی سے) تم سچ کہتے ہو ـــــــ میرے چاروں طرف آگ

ہی آگ ہے ــــ باباکی نوازشات پہلے ہی مجھے جھلسا دینے کو کیا کم تھیں۔ اس پر۔

مراد: (بات کاٹ کر) صورتِ حال کچھ ایسی پریشان کُن تو نہیں۔ لیکن تم ضمیر ضمیر لیے پھرتے ہو ــــ اب تمہیں اس سلسلے میں کوئی کیا دلاسہ یا تسلی دے۔

عادل: محبت خلوص کی متقاضی ہوتی ہے اور تم جانتے ہو ــــ اس معاملے میں خلوص کس طرح مجروح ہو رہا ہے۔ میرا ضمیر تو پہلے ہی مجھے معاف نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب ــــ اب میں کیا کروں ــــ بابا نے کس محبت پیار اور خلوص سے مجھے اپنی فرزندی میں لینے کا فیصلہ کیا ہے ــــ

مراد: صرف یہیں تک سوچ محدود رکھو ــــ کہ تمہاری دلی خواہش پوری ہو گئی۔

عادل: اوہ تم کتنے کورے ہو ــــ

مراد: تو پھر شائستگی سے بابا کے فیصلے کو لوٹا دو۔

عادل: (مراد کا منہ دیکھتے ہوئے) تم چاہتے ہو ــــ میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں۔

مراد: تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو ــــ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا۔

عادل: میں بابا کے سامنے اعترافِ جرم کر لوں گا ــــ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یوں اور صرف یوں ہی میرا ضمیر چین پا سکتا ہے۔ محبت کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ میں اب انہیں دھوکہ ......

مراد: (اچانک ہاتھ اٹھتا ہے اور غصے میں وہ ایک بھرپور تھپڑ عادل کے گال پر مارتا ہے) غدار!

عادل: (گال پر ہاتھ رکھ کر دانت ہونٹوں میں گاڑتے ہوئے) میری مجبوری کو دیکھو مراد ــــ میری بے بسی پر رحم کھاؤ ــــ

مراد: (غصے سے) بکواس بند کرو ــــ میں پہلے بھی تمہیں کہہ چکا ہوں کہ تمہاری

محبت کام میں حارج ہوئی تو میں برداشت نہیں کروں گا ـــــ تم، بابا یا ماہ رخ کے سامنے اعتراف کر کے یہاں آنے کے مقصد پر ہی پانی پھیر دینا چاہتے ہو ـــــ کیا یہ مغل حکومت سے غداری نہ ہوگی۔ اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کی خاطر تم اپنی حکومت کو اتنا بڑا نقصان پہنچانے کی سوچ رہے ہو ـــــ تمہارا کیا خیال ہے تمہارے اعتراف پر حکومت کا راز نہ کھل جائے گا۔

عادل: (شرمندگی سے سر جھکا لیتا ہے) مراد!

مراد: (اسی لہجے میں) تم حلف اٹھا کر اس کام کا بیڑہ اٹھا چکے ہو ـــــ تمہارے قدم ڈگمگانے سے پہلے میں تمہیں ختم کر دوں گا۔

عادل: (سر جھکائے ہوئے) مجھے معاف کر دو مراد ـــــ میں کش مکش کے جان لیوا عذاب سے گھبرا گیا ہوں ـــــ بابا کے فیصلے نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا ہے ـــــ سوچو تو سہی میں کس اذیت سے دوچار ہوں۔

مراد: یہ سب باتیں تمہیں پہلے سوچنا چاہیئے تھیں۔

عادل: تقدیر نے مجھے فرصت ہی کب دی ـــــ میری جگہ تم ہوتے، تو کیا کرتے مراد ـــــ

مراد: میں محبت کو اپنے عظیم فرض پر بخوشی قربان کر دیتا۔

عادل: مراد! (بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا ہے)

مراد: (دل پسیج جاتا ہے) آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) مجھے معاف کرنا دوست ـــــ میرا ہاتھ تم پر اٹھ گیا ـــــ تم واقعی چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہو ـــــ لیکن ہمت، حوصلہ اور بردباری سے کام لینا چاہیئے ـــــ حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ دو ـــــ تم ماہ رخ کو دیوانگی کی حدود سے بھی آگے نکل کر چاہتے ہو۔ میں جانتا ہوں۔ تم نے اب تک اپنے متعلق اسے کچھ نہ بتا کر اندھیرے میں بھی رکھا ہوا ہے ـــــ یہ ظلم ہے مجھے خود بھی اس کا احساس ہے۔ محبت میں جب ایسا ظلم روا رکھا جائے

توانسانیت چیخ اٹھتی ہے ـــــ لیکن ہمارا کام اس سطح سے بہت اونچا ہے ـــــ ارفع واعلیٰ ـــــ اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر سوچو ـــــ عادل ـــــ

عادل: مراد ـــــ میں یہ سب باتیں سمجھتا ہوں۔

مراد: تو پھر ذرا ہمت مجتمع کرو ـــــ اور حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ دو۔ ہمیں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑنا ـــــ مکمل کرنا ہے ـــــ یہ ہماری ذات کا معاملہ نہیں۔ یہ ملکی مفاد ہے ـــــ اس مفاد پر ہزار محبتیں قربان کی جا سکتی ہیں ـــــ کیوں کہ یہ کام ساری محبتوں سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔

عادل: (سر جھکا کر) ضمیر بڑا بے رحم منصف ہے ـــــ

مراد: (اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے) اس کڑی آزمائش سے ٹکرا جانا ہی آئینِ جوانمردی ہے عادل۔ بزدلوں کی طرح یوں ہتھیار ڈال دینا کم از کم تم جیسے انسان کے شانِ شایان نہیں ـــــ اوّل یا آخر پہلو میں دھڑکتے اس گوشت کے لوتھڑے کو تمہیں کچلنا ہی پڑے گا۔

عادل: (تڑپ کر) مراد۔

مراد: یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے آنکھیں بند کرنا خود کو دھوکا دینا ہو گا ـــــ ـــــ تم دونوں صورتوں میں تباہ ہو چکے ہو عادل ـــــ ماہ رخ کو بتا دو جب بھی۔ نہ بتاؤ جب بھی۔

عادل: (دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا کر) تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

مراد: عادل! (شانہ تھپکتا ہے۔)

عادل: بربادی میرا مقدر بن چکی ہے (گہری آہ بھر کر) میں لٹ چکا ہوں۔

مراد: تمہاری حالت بے شک قابلِ رحم ہے۔ اپنے محبوب کی ممکنہ قربتوں کے باوجود تم اس سے صدیوں کے فاصلے پر ہو ـــــ رنگ و نور کا سیلاب تمہارے چاروں طرف بہہ رہا ہے۔ لیکن تم لامتناہی اندھیروں میں گھرے ہو۔

عادل: (بے چینی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے) یہ بد قسمتی ہی ہے نا۔

مراد: اس سے نپٹنے کا طریق سوچو —— پریشان رہنے سے کچھ نہیں بنے گا —— اپنے آپ کو اس وار کے لیے تیار کرو —— ناکامی سے دوچار ہونے کے لیے اپنے ذہن دل ودماغ کو ہمہ وقت آمادہ رکھو۔ دو نہیں تو چار —— چار نہیں تو آٹھ دن تک ہمیں یہاں سے چلے جانا ہوگا۔ میرا کام تو تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ تم بھی میرے خیال میں سب کاغذات تیار کر چکے ہو۔

عادل: ہاں ——

مراد: اب ہمیں واپس جانے کے متعلق سوچنا اور منصوبہ بنانا ہے۔

عادل: (تڑپ جاتا ہے) واپس ——؟

مراد: (اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے) ہاں عادل! ہمیں واپس جانا ہے۔ خوش فہمیوں میں مبتلا رہنا چھوڑ دو —— اپنی ناکامیوں سے نپٹنے کی راہیں بناؤ ——

عادل: مراد!

مراد: (اس کی بے بس تڑپ سے بے طرح مضطرب ہو کر اسے گلے سے لگا لیتا ہے۔) میرے دوست! میرے عزیز بھائی!

(عادل چھوٹے سے بچے کی طرح اس کے کندھے پر اپنا سوچوں سے پریشان سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔)

——— ⁂ ———

(چھوٹی سی مخملیں نشستوں والی منقش کشتی ندی کے بہاؤ پر روانی سے چلی جارہی ہے۔ستاروں کا عکس لہروں میں کانپ رہا ہے۔کناروں پر جھکے درخت لہروں کا سفر دیکھ رہے ہیں۔ ماہ رخ کا ہلکا گلابی ریشمی لباس ہوا کی چھیڑ سے حسین سرسراہٹیں پیدا کر رہا ہے۔اس کے بالمقابل عادل بیٹھا ہے۔ہاتھ چپو پر ہے۔لیکن کسی سوچ میں ڈوبا ہے ـــــ آدھا چاند مینہ چرخ سے اپنی نامکمل روشنی بکھیر رہا ہے۔

ماہ رخ : (پریشان سی ہو جاتی ہے) عادل۔

عادل : (ایک دم چونک کر) کیوں ماہ رخ۔

ماہ رخ : آپ پریشان ہیں۔

عادل : نہیں ـــــ نہیں تو ـــــ۔

ماہ رخ : آج نہیں ـــــ بلکہ کئی دنوں سے میں آپ کو پریشان دیکھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی ذہنی کوفت سے دوچار ہیں۔

عادل : (ماہ رخ کو غور سے دیکھ کر) یہ تمہارا وہم ہے ماہ رخ۔

ماہ رخ : (سنجیدگی سے) ہم دونوں جذبات کے بندھن سے نہیں بندھے عادل۔ ہمارا رشتہ اٹل سچائی اور خلوص کا رشتہ ہے۔ہم ایک دوسرے کی دھڑکنوں کی زبان سمجھتے ہیں ـــــ نظروں کو سمجھتے ہیں۔

عادل : (کانپ جاتا ہے) اوہ! ماہ رخ!

ماہ رخ : (اسی آہنی سنجیدگی سے) ہمارے جذبوں کے تقدس اور خلوص اور سچائی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے آئینہ بن جائیں۔ کوئی سایہ، کوئی پردہ اس آئینے پر نہیں آنا چاہیئے۔

عادل : ماہ رخ ——— کوئی اور بات کرو ——— (گھبراہٹ میں لبوں پر زبان پھیرتا ہے)

ماہ رخ : تو آپ نہیں بتائیں گے۔

عادل : کیا ———؟

ماہ رخ : یہی کہ کیا پریشانی ہے ——— جو آپ کے حواس کو مختل کیے ہوئے ہے۔ دیکھئے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ——— آپ کی صورت غماز ہے آپ کی نگاہیں بتا رہی ہیں ———

عادل : (جبراً مسکرا کر) تم ناحق پریشان نہ ہو۔

ماہ رخ : آپ کے یوں کہنے سے میری پریشانی تو ختم نہیں ہو سکتی ——— (ایک دم اس کی آنکھوں میں جھانک کر) عادل۔

عادل : ہوں ———

ماہ رخ : کہیں تم بابا کے فیصلے سے تو پریشان نہیں۔

عادل : (بے اختیاری سے) اوہ ماہ رخ ——— تم نے کتنی غلط بات سوچی ——— بابا کا فیصلہ تو میری زندگی ہے ماہ رخ ——— مجھ سا خوش نصیب دنیا میں کوئی نہیں ر

ماہ رخ : تو پھر!

عادل : کئی باتیں۔ کئی وجوہ، کئی مسائل ہو سکتے ہیں۔

ماہ رخ : کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ ان مسائل، وجوہ اور باتوں کے متعلق آپ کا اعتماد حاصل کر سکوں۔

عادل : (پریشان سے پریشان تر ہو کر) خدا کے لیے ماہ رخ ——— باتوں کا رخ

بدل دو۔

ماہ رخ : کشتی واپس موڑ دیتے (چہرہ ایک دم اتر جاتا ہے۔ نگاہیں اداس ہو جاتی ہیں۔) آگے جانے کی ضرورت نہیں۔

عادل : (کرب سے) ناراض ہو گئیں۔

ماہ رخ : واپس چلیئے۔

عادل : (بیچارگی سے) مجھ پر رحم کھاؤ ماہ رخ ——— میں کش مکش کی آگ میں جل رہا ہوں۔ میں بڑے نازک مسئلے سے نپٹ رہا ہوں۔ تم یوں میرا ساتھ نہ چھوڑو ——— مجھے سہارا دو ——— میں خطرناک موڑ پر کھڑا ہوں ——— تمہیں نہیں بتا سکتا کہ میں ——— میں ——— (گہری آہ کو روکتے ہوئے) میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بخدا اس وقت اس ذکر کو جانے دو ——— مجھے صرف چند دن کی مہلت دو ——— میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا ———

ماہ رخ : (گھبرا جاتی ہے) معاف کرنا عادل میں نے آپ کو پریشان کیا۔

عادل : (آنکھیں بند کر کے ہونٹ کاٹتا ہے) تقدیر ہمیں بعض اوقات کتنا مجبور کیسا پابند کر دیتی ہے ——— ماہ رخ ——— میں ——— میں فی الحال تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ ——— تم کوئی اور باتیں کرو ——— کچھ اور سوچو ——— موسم کی باتیں کرو۔ ندی کی آغوش میں سما جانے والے تاروں بھرے آسمان کی باتیں کرو۔

ماہ رخ : (دکھی انداز میں) بہتر ہو گا ہم واپس لوٹ جائیں۔

عادل : (اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھتا ہے) ماہ رخ ——— ناراض ہو جاؤ گی۔ تو میں اس طرح ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا کہ تمہیں ملبے کا ڈھیر بھی نہیں ملے گا۔

ماہ رخ : (گھبرا کر بات کاٹ دیتی ہے) یوں نہ کہو عادل۔

عادل : (اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر) میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں پریشان ہوں۔ ایسی عذاب دہ کش مکش میں ہوں۔ جس کا عشر عشیر بھی تم اپنے ذہن میں نہیں لا سکتیں ——— مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میری پریشانی براہ راست تم پر اثر انداز

ہو رہی ہے۔ لیکن ـــــ میں مجبور و لاچار انسان ـــــ اس ضمن میں ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــ

ماہ رخ: (عادل کے کندھے سے نڈھال ہو کر اپنا سر لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے ـــــ)
یہ آزمائش کی کون سی منزل ہے عادل ـــــ تمہارا سارا کرب، ساری اذیت میں اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔

عادل: (انتہائی بیچارگی، دکھ اور کرب سے ماہ رخ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیتا ہے ـــــ) ماہ رخ ـــــ میری روح ـــــ میری زندگی ـــــ

ماہ رخ: (بے خودی سے) تم نے مجھے اور الجھا دیا ہے عادل ـــــ کیا اس تانے بانے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ـــــ تم اتنے مایوس کیوں ہو۔

عادل: (بے تابی سے اسے اپنے اور قریب کر لیتا ہے) ماہ رخ۔

ماہ رخ: کہیں مستقبل کی کوئی نحوستیں تو ہم پر سایہ ڈالنے کو نہیں بڑھ رہیں۔ (عادل کا گریبان ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے) عادل تم اپنی محبت میں ایمان داری سے ثابت قدم تو رہو گے نا ـــــ

عادل: میری محبت پر شک نہ کرو ماہ رخ ـــــ فنا کی منزل سے عادل بہت پہلے گزر چکا ـــــ اس لمحے جب بے ہوشی میں ڈوبتی نظروں نے تمہارا رُخِ زیبا دیکھا تھا ـــــ عادل کی اپنی ہستی تو اسی جلتے لمحے فنا کی لپیٹ میں آ گئی تھی ـــــ یہ عادل تو تمہاری ہی ذات کا حصہ ہے ماہ رخ۔ تمہارے سہارے جی رہا ہے ـــــ

ماہ رخ: (سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے مسکرا کر) تمہارے جذبات کے تقدس و پاکیزگی کو میں جانتی ہوں۔ تمہاری محبت کی بلندی کو میں دیکھتی ہوں ـــــ تمہارے عشق کی انتہا کو میں محسوس کرتی ہوں۔

عادل: (قدرے سنبھلتے ہوئے) تقدس و پاکیزگی کو تکمیل تک پہنچانے۔ بلندی کو چھونے اور انتہا کو پانے کے راستے دشوار گزار ہوتے ہیں۔ کسی مرحلے، کسی

مقام پر کوئی بھنور آجاتا ہے۔ کوئی چٹان ابھر آتی ہے۔ انسان اس سے پریشان بھی ہو جاتا ہے —— خلوص اور سچائی متقاضی ہوتے ہیں کہ راستہ صاف کیا جائے۔

ماہ رخ : خدا کرے تم اپنی کش مکش اور پریشانی سے جلد نجات پالو۔

عادل : تمہاری محبت مجھے تھام لے گی نا ماہ رخ ——

ماہ رُخ اپنا سر پھر اس کے کندھے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر سکون کا پرتو ہے —— عادل اسے سینے میں سمو لینے کے انداز میں قریب کر لیتا ہے —— لیکن یک جائی اور قربت کے نقطۂ عروج کے باوجود عادل کے چہرے پر سکون و اطمینان نہیں۔ خلا میں نظریں جمائے وہ مضطرب اور پریشان نظر آتا ہے۔)

—— ⁘ ——

(ماہ رخ شجاع کی قبر پر چراغ روشن کر کے کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہتی ہے۔
اس کی حیران آنکھوں میں جما ہوا اضطراب ہے۔ وہ اکیلی بیٹھی ہے۔ رات جھک آئی
ہے ـــــ وہ یوں بیٹھی ہے جیسے گرد و پیش سے بے خبر ہو ـــــ افشاں اس
کی تلاش میں ادھر آنکلتی ہے ـــــ)

افشاں: ماہ رخ! تم یہاں بیٹھی ہو ـــــ کہاں کہاں میں نے تمہیں نہیں ڈھونڈا۔

ماہ رخ: (چونک کر) اوہ ـــــ تم افشاں ـــــ (اٹھتے ہوئے) بس میں آنے
ہی والی تھی ـــــ

افشاں: رات کتنی ڈھل آئی ہے ـــــ

ماہ رخ: بعض اوقات انسان وقت کی بندشوں سے آزاد ہونے کا حیلہ کرتا ہے۔

افشاں: تمہیں کیا ہو گیا ہے ماہ رخ ـــــ دن رات الجھی رہتی ہو۔ شجاع بھائی کی موت
نے بھی تمہیں اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ نہ کیا تھا۔

ماہ رخ: چلو چلیں۔

(دونوں نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آجاتی ہیں۔ شانہ بشانہ چلتی ہیں ـــــ)

افشاں: ماہ رخ ـــــ تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو ـــــ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے
ـــــ تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔ جسے تم نے چاہا ـــــ اسے پا لیا ـــــ

ماہ رخ: ہاں

افشاں : اوہ ــــ اچھا ــــ شاید خوشی کی انتہا میں تمہیں شجاع بھائی کی یاد شدت سے آنے لگی ہے۔ یہی بات ہے نا ــــ

ماہ رخ : (گم سم سی) ہوں۔

افشاں : (اسے پیار سے لپٹا کر) میں یہ تو نصیحت نہیں کر سکتی کہ خوشی کے لمحوں کو تم غم کی شدتوں سے الگ کر دو ــــ لیکن تمہیں احساس ہونا چاہیئے ــــ تمہاری خوشیوں کا پلڑا بھاری ہے۔ تمہارا محبوب تمہارا عادل تمہارے بھائی کے خون کا انتقام لینے کی قسم کھاتا ہے۔ تمہارا اور بابا کا کتنا دکھ بانٹ لیا ہے اس نے یہ عہد کر کے۔

ماہ رخ : ہاں!

افشاں : تو پھر ــــ اتنی پریشان تو نہ رہا کرو۔

ماہ رخ : افشاں ــــ مجھے پریشانی اس بات سے نہیں ــــ

افشاں : تو پھر کیا ہے؟

ماہ رخ : عادل کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔

افشاں : (جلدی سے) کیا ہو گیا ہے۔

ماہ رخ : وہ ان دنوں اتنا پریشان رہتا ہے کہ تمہیں بتا نہیں سکتی۔

افشاں : وجہ؟

ماہ رخ : میرے اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہیں بتایا۔

افشاں : شاید اسے اپنی غریب الوطنی کا احساس ہو۔ ماں باپ کی محرومیت کا خیال ستانے لگا ہو۔ خوشی کے موقعوں پر تو بھولی بسری محرومیتیں بھی جاگ اٹھتی ہیں۔

ماہ رخ : (تذبذب سے) ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس ضمن میں تو میں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔

افشاں : اس کی محبت پر تو تمہیں شک نہیں نا؟

ماہ رخ : عادل مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے افشاں ــــ اس کی دیوانہ محبت اب

کسی اظہار کی محتاج نہیں رہی ـــــ صادق جذبوں پر ایمان نہ لانا ان کی توہین
کے مترادف ہے افشاں۔

افشاں: (تسلی دیتے ہوئے) تو پھر تمہیں تو یوں اپنے سے بیگانہ بننے کی ضرورت
نہیں ـــــ تم تو پریشانیوں کو اپنے اوپر مسلط ہونے کی دعوت دیتی ہو

ماہ رخ: میں کیا کروں ـــــ میرے بس میں نہیں۔

افشاں: جذباتی تو تم ہو ہی ـــــ اب ذرا اپنے آپ پر قابو رکھا کرو۔ عملی زندگی
میں قدم رکھنے والی ہو ـــــ حوصلے، ہمت اور بردباری ہی کام آتی ہیں
اس زندگی میں ـــــ

ماہ رخ: (قدرے مسکرا کر) تم تو جیسے اس زندگی کا تجربہ رکھتی ہو نا ـــــ

افشاں: تم سے بہر حال بہتر ہی ہوں۔

ماہ رخ: تو پھر بابا سے کہہ دوں۔

افشاں: کیا؟

ماہ رخ: حسن خان کو جلدی بلا بھیجیں۔

افشاں: (شرما کر) ہٹو ـــــ بڑی آئیں۔

ماہ رخ: اپنی دفعہ نام سے ہی شرما گئیں ـــــ ویسے بتا دوں ـــــ اوائل سرما
میں بابا تمہیں بھی پار کر دیں گے ـــــ حسن خان آ رہا ہے ـــــ وہ مزید
انتظار نہیں کر سکتا ـــــ

افشاں: (اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) جلدی جلدی قدم اٹھاؤ۔ رات کتنی ڈوب
چکی ہے ـــــ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

ماہ رخ: جھوٹی کہیں کی ـــــ اندھیرا اتنا خوف ناک بھی نہیں ـــــ تاروں کی ٹھنڈی
روشنی میں میرا تو جی چاہتا ہے ابد تک رکی رہوں ـــــ

افشاں: تو تم رہو اکیلی۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔

ماہ رخ: حسن خان کی یاد سے لپٹ کر سونا چاہتی ہو نا ـــــ ٹھیک ہے جی پرانا

عاشق زار ہے۔ بچپن کا منگیتر ——

افشاں: (بات کاٹ کر) ماہ رخ بس بھی کرو —— شیخ کتنا سنسان علاقہ ہے۔

ماہ رخ: میں تو روز یہاں آتی ہوں۔ پہروں یہاں گھومتی پھرتی ہوں۔

افشاں: عادل کے ساتھ آتی ہو نا ——

ماہ رخ: (مسکرا کر) آج تمہارا ساتھ سہی ——

افشاں: اللہ اب جلدی جلدی قدم اٹھاؤ نا —— خدا قسم مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس سامنے والی شکستہ دیوار سے تو مجھے دن کی روشنی میں بھی ڈر لگتا ہے۔ بابا اسے گروا کیوں نہیں دیتے۔

ماہ رخ: ہوسکتا ہے بابا کے ماضی کی کوئی خوبصورت یاد اس دیوار سے وابستہ ہو —— میں نے بھی کئی دفعہ بابا سے کہا ہے۔ اس اکیلی دیوار کو باغ میں سے ہٹوا دیں۔ لیکن مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں ——

افشاں: ذرا ہٹ کر چلتے ہیں۔

ماہ رخ: پگلی —— دیوار ہی ہے نا —— ڈرنے کی کیا بات ہے۔

افشاں: بس مجھے ڈر لگتا ہے۔

ماہ رخ: تو پھر آج میں تمہیں اس دیوار کے ساتھ ساتھ لے کر چلوں گی۔ یہیں سے حویلی تک جائیں گے ——

افشاں: میں نہیں جاؤں گی ——

ماہ رخ: تمہیں میری قسم آؤ ——

افشاں: (رک کر) ایسی باتوں میں قسم کھانے کی کیا تک ہے۔

ماہ رخ: تم آؤ —— اس طرح تمہارے ذہن سے جو خوف چپکا ہوا ہے، ختم ہو جائے گا۔

ماہ رخ: (افشاں ڈرتے ڈرتے ماہ رخ کے ساتھ چلتی ہے۔ اس نے مضبوطی سے ماہ رخ کا ہاتھ تھام رکھا ہے —— اچانک دونوں چونک کر ایک دوسرے

کی طرف دیکھتی ہیں۔ دیوار کے دوسری طرف کسی کے باتیں کرنے کی آواز ہے۔)

افشاں : (ڈر کر) کوئی ہے!

ماہ رخ : کیا ہوا — کوئی باغ کا رکھوالا ہوگا — پہرے دار ہوگا۔

افشاں : باغ کے رکھوالے اور پہرے دار کو سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے —

ماہ رخ : واقعی —! تم خاموشی سے چلتی آؤ دیکھتے ہیں کون ہے۔ وہ شگاف ہے نا اس میں سے دوسری جانب دیکھ کر پتہ چلے گا۔

افشاں : نہ جاؤ ماہ رخ —

ماہ رخ : تم خاموشی سے چلتی آؤ۔

دونوں دروازہ نما شگاف میں داخل ہوتی ہیں۔ چند انچوں کے فاصلے پر دو سایے ہیں۔ ماہ رخ کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ کہ وہ عادل اور مراد ہیں — وہ کچھ کہنا ہی چاہتی ہے کہ دونوں کی آواز سے چپ ہو جاتی ہے — افشاں کو منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے۔ ان کے لب و لہجے سے محسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ کوئی اہمیت کی گفتگو کر رہے ہیں) ؛

—— ⁂ ——

(ماہ رخ اور افشاں کی موجودگی سے بے خبر دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ عادل کی آواز افسردہ ہے۔ مراد قدرے جوش میں ہے)

مراد : یہ حماقت ہوگی عادل۔ یہاں رہنا تمہاری یقینی ہلاکت ہے۔ یہاں جاسوس کو زندہ گاڑ دیا جاتا ہے۔

عادل : تم اس کے متعلق کچھ نہیں سوچو۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

مراد : میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں یوں مصائب و آلام کے سمندروں میں غوطے کھانے کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اتنی بے رحم موت مرنے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

عادل : پاگل نہ بنو۔

مراد : یہی الفاظ میں تم سے کہتا ہوں ــــــ میرے ساتھ تم بھی آج یہاں سے فرار ہو گے۔

عادل : تکرار کا وقت نہیں مراد ــــ میں نے سارے کاغذات ترتیب دے لیے ہیں ــــ تم نے بھی سارا کام ختم کر لیا ہے۔ معلومات کا یہ ذخیرہ لے کر آج رات تمہیں سرحد پار کر جانا ہے ــــ سمجھے ــــ

مراد : تم یہ حکم مجھ پر نہیں ٹھونس سکتے۔

عادل : حکم نہ تو استدعا ہی سہی ــــــ بہر حال آج رات کے پچھلے پہر تمہیں یہاں سے فرار ہو جانا ہے۔

مراد : تو تم سنجیدگی سے کہہ رہے ہو کہ میرے ساتھ نہیں چلو گے۔

عادل : تم ایسے بودے دماغ کے تو نہیں ہو جو میری بات نہ سمجھ سکو۔ میرے ذمہ جو فرض تھا۔ میں نے پورا کر دیا۔

مراد : مجھے احساس ہے کہ اپنی کرب ناک اذیتوں کے باوجود اک بہادر انسان کی طرح تم نے اپنے جذبات کو شکست دے کر مغل حکومت کے لیے پوری ایمان داری سے کام کیا ہے۔ تم جیسا مخبر پورے ہندوستان میں نہیں مل سکا۔

عادل : شہنشاہِ عالمگیر نے جو خدمت مجھے سونپی تھی شکر ہے ثابت قدمی سے میں نے نباہ دی —— یہ سارے خفیہ راز —— فوجی اہمیت کی خبریں، ذخائر کے مقام نقشہ جات میں نے اکٹھے کر کے رکھ لیے ہیں۔ آج رات تم انہیں لے کر سرحد پار کر جاؤ۔

مراد : آج ہی رات ؟

عادل : ہاں مراد —— اب میں اپنی ناکامی سے لڑتے لڑتے ہار چکا ہوں۔ ضمیر کی آواز اب چیخ بن کر پھٹ جانے کو ہے —— ڈرتا ہوں ایک دن بھی اور نہ گزر سکے گا۔ بہتری اسی میں ہے —— کہ تم آج رات یہاں سے نکل جاؤ —— یہ معلومات ضرورت سے زیادہ ہیں۔ مغل حکومت کی راہنمائی کو بہت ہیں۔ اب مغل فوجیں آنکھیں بند کر کے ان معلومات کے سہارے گولکنڈہ پر برق بن کر گر سکتی ہیں ——

مراد : گولکنڈہ کی حالت بیجاپور سے بہت نازک ہے۔ محاصرہ طول نہیں پکڑے گا۔ والی کو حملہ ہوتے ہی ہتھیار ڈال دینا پڑیں گے۔

عادل : خدا ہماری فوج کو کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔

مراد : عادل تم یہاں رہ کر اک سنہرے مستقبل کو ٹھکرا رہے ہو —— جانتے ہو ہماری ان خدمات کا صلہ کتنا حوصلہ افزا ہو گا۔

عادل : میری نظروں میں ماضی ہے نہ مستقبل —— میں تو حال کے خونی دانتوں میں

دبا ہوا ہوں ـــــ ماہ رخ سے اب میں کب تک بہانے بنا کر اپنی پریشانیاں مستور رکھوں مراد ـــــ اب دھوکہ اور فریب اس نقطے پر پہنچ چکے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے از خود پھٹ جائیں گے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم آج رات یہ علاقہ چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ ـــــ ایسا نہ ہو۔ کہ میری جذباتی لغزش سے بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ تم آج چلے جاؤ۔

مراد : عادل تم یہاں رہ کر کیوں بربادی کو گلے لگانا چاہتے ہو۔

عادل : (زہر خند) بربادی تو ہو چکی ـــــ میرا ہر سانس زخمی ہے۔ میرا سینہ فگار ہے ـــــ تمہارے جانے کے بعد میں اعتراف جرم کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔

مراد : تم پاگل ہو چکے ہو ـــــ ! ماہ رخ کی نفرت اور بابا کے عتاب کو سہہ گزرو گے۔

عادل : میں اسے اپنے کئے کی سزا سمجھ کر سینے سے لگا لوں گا ـــــ چین سے مر تو سکوں گا۔ روح پر یہ بوجھ تو نہ ہو گا کہ میں نے محبت میں خلوص کا گلا کاٹ کر سزا نہیں پائی ـــــ میں ماہ رخ کو بتا دوں گا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھ رہی ہے۔ میں بھٹکا ہوا راہی نہیں۔ مغل حکومت کا جاسوس ہوں۔ میں بیجاپور کا نہیں۔ دہلی کا رہنے والا ہوں۔ بے یار و مددگار نہیں بھرے پرے خاندان کا فرد ہوں ـــــ

مراد : (بیچارگی سے) عادل اپنے والدین کے لیے، چھوٹی بہنوں کے لیے پیارے بھائیوں کے لیے فیصلہ بدل ڈالو ـــــ وقت کا مرہم محبت کا گھاؤ بھر دیگا۔

عادل : (زہر خند) افسوس کہ اتنے قریبی اور جگری دوست ہو کر بھی تم میری محبت کا اندازہ نہ کر سکے۔ میری زندگی کی ابتدا و انتہا ماہ رخ ہے مراد میں اسی کیلئے زندہ ہوں اور اسی کے لیے مر جاؤں گا ـــــ

مراد : عادل۔

عادل : اچھا یہ باتیں چھوڑو ـــــ ہاں تو آج رات کے پچھلے پہر میں تمہیں یہاں سے

نکال کر لے جاؤں گا۔۔۔ اس رہائش گاہ کا عقبی دروازہ اس راستے پر کھلتا ہے جو سرحد سے قریب اور محفوظ ترین ہے۔ گھوڑوں کا بندوبست میں کر چکا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ سرحد تک چلونگا۔

مراد : (عادل سے لپٹ جاتا ہے) عادل۔۔۔ میرے بھائی!۔۔۔

عادل : (غمزدہ آواز میں) میرے دوست۔

(چند لمحے دونوں لپٹے کھڑے رہتے ہیں۔۔۔ پھر آہستگی سے دونوں الگ ہوتے ہیں)۔

عادل : چلو اب چلیں۔۔۔ میں نے یہی بتانے کو تمہیں یہاں بلایا تھا۔

مراد : میری ہمت تمہارے بغیر ٹوٹ نہ جائے۔۔۔

عادل : پاگل نہ بنو۔۔۔ میں سرحد تک تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ سرحد پار کرنے کے بعد تمہیں کوئی خدشہ درپیش نہ ہو گا۔

مراد : مجھے ان خدشوں کی پرواہ نہیں۔ مجھے تو تمہارے چھٹ جانے کا غم ہے۔

عادل : غم جھیلنے کا تو تم نے ہمیشہ مجھے سبق دیا۔۔۔ اب کیسی باتیں کر رہے ہو۔۔۔ چلو۔۔۔ چہرے پر بشاشت کے آثار پیدا کر لو۔۔۔ بابا کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی جہاندیدہ نظریں سمجھ جائیں۔

مراد : کہ ہم پردیسی نہیں مغل حکومت کے زیرک جاسوس ہیں (ہنستا ہے)

عادل : اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔ رات کی تیاری کرو۔ کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلے جانا۔۔۔ میں بھی آج اپنے کمرے میں رہوں گا۔ رات آدھی گزر جائے گی تو میں تمہیں لے کر عقبی دروازے سے نکل جاؤں گا۔

مراد : بہت بہتر۔۔۔ (گہری آہ بھر کر) خدا تمہارا حافظ و نگہبان ہو گا۔

عادل : (مسکرا کر) ان دعاؤں کا میں مستحق ہوں نہ طالب۔ ہاں میرے یہی جذبات پوری صدق دلی سے تمہارے لیے ہیں۔۔۔ آؤ۔۔۔ چلیں۔۔۔

(دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہاں سے باتیں کرتے ہوئے چل دیتے ہیں)۔

(کمرے میں فانوسوں کی روشنی جگمگا رہی ہے. قالین پردے مسندیں مسہری ہر چیز جاندار سی چمک لیے ہوئے ہے. چاندی کے گلدانوں میں صبح کے رکھے ہوئے پھول اس وقت اپنی بہار کھو چکے ہیں. پھر بھی روشنی میں ان کی اڑتی بہار کی کمزور خوبصورتی نرالی سی لگ رہی ہے. سانولی ماہ رخ اور افشاں کے کھانے کے خوان لیے بیٹھی ہے۔ ماہ رخ ابھی تک شجاع کی قبر پر چراغ روشن کر کے نہیں لوٹی —— سانولی اٹھ کر دروازے تک جاتی ہے. لیکن باہر جانے سے پہلے ہی ٹھٹک جاتی ہے —— افشاں ماہ رخ کو بمشکل سہارا دیئے اندر لا رہی ہے. افشاں کا چہرہ بھی فق ہے. —— آنکھیں حیرت سے پھٹی ہیں. قدم لڑکھڑا رہے ہیں —— لیکن ماہ رخ کی حالت دگرگوں ہے. جیسے جان کنی کے عالم میں ہو —— چہرہ لاش کی طرح سپید ہے. سانولی آگے بڑھ کر اسے افشاں کے کندھے سے گرتا دیکھ کر تھام لیتی ہے —— دونوں ماہ رخ کو اندر لا کر مسہری پر لٹا دیتی ہیں. ماہ رخ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں)۔

سانولی: (گھبرا کر) کیا ہوا انہیں —— (جلدی سے جوتے اتارتی ہے پاؤں ملتے ہوئے) ہائے اللہ —— کچھ بتائیے نا —— انہیں کیا ہو گیا ——

(افشاں پٹی کے قریب سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہے —— سانولی ماہ رخ کا چہرہ ہاتھ سے چھوتی ہے)۔

سانولی: (بے طرح گھبرا کر) انہیں کیا ہوا ہے بی بی —— کچھ بتائیے نا —— حکیم

صاحب کو بلاؤں دیکھیں نا —— چہرہ کس قدر سپید پڑ گیا ہے۔ ہونٹ تک پیلے ہو گئے ہیں —— نصیبِ دشمناں ——

افشاں: (ڈوبتی آواز میں) خاموش رہو سانولی۔

سانولی: آقا کو بلا لاؤں۔

افشاں: میں نے کہا ہے۔ تم خاموش رہو ——

سانولی: (گھبراہٹ میں ہاتھ ملتے ہوئے) لیکن بانو ——

افشاں: (غصے سے) کہہ دیا ہے خاموش رہو —— نہیں رہ سکتیں تو کمرے سے نکل جاؤ۔

سانولی: (روہانسی ہو کر) ہائے اللہ ——

افشاں: (ماہ رخ پر جھک کر) ماہ رخ!

ماہ رخ: (آنکھیں کھول دیتی ہے —— پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ چاروں طرف پاگلوں کی طرح دیکھتی ہے۔ پھر آنکھیں ملتی ہے ——) افشاں —— میں نے خواب تو نہیں دیکھا۔

افشاں: (سر جھکا کر) خواب اتنے زہرناک نہیں ہوتے ——

ماہ رخ: (دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی ہے ——) میرا سر چکرا رہا ہے افشاں —— مجھے کچھ سوجھ بوجھ نہیں رہا —— مجھے کیا ہو رہا ہے —— میرا دل بیٹھا جا رہا ہے ——

افشاں: (خود بھی پریشان ہے —— لیکن ماہ رخ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے) لیٹ جاؤ —— کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔

ماہ رخ: (لیٹنے کی بجائے اٹھ کر قالین پر چلنے لگتی ہے —— وہ اپنی کنپٹیاں سہلاتی ہے۔ آنکھیں کبھی کھولتی کبھی بند کرتی ہے —— پھر ایک دم زور زور سے چیخنے لگتی ہے) افشاں —— افشاں —— افشاں —— (تشنجی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے)۔

افشاں: (آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں ——) ماہ رخ! بخدا حوصلہ نہ ہارو۔

دل سے لپٹا لیتی ہے)

ماہ رخ : (اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے) افشاں یہ کیا ہو گیا افشاں۔ کہہ دو یہ سب حقیقت نہیں خواب تھا ——

سانولی : خدا کے لیے کچھ مجھے بھی بتائیے۔

ماہ رخ : (سانولی کی طرف روتی آنکھوں سے دیکھ کر) کیا پوچھتی ہے سانولی، تجھے کیا بتائیں —— کیوں کر بتائیں —— تو نے بھی کچھ نہ سمجھا —— تو نے بھی کچھ نہ جانا ——

سانولی : (سخت گھبرا کر) بانو —— کچھ مجھے بھی تو سمجھائیے ——

ماہ رخ : عادل کی آواز تو ہی مجھ تک پہنچاتی رہی ہے —— تو ہی اسکی پیغامبر بنی رہی ہے ——

سانولی : تو —— تو کیا ہوا نہیں ——

ماہ رخ : وہ —— وہ ——

افشاں : (بات کاٹ کر جلدی سے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) ماہ رخ —— (پھر سانولی سے) تم جاؤ سانولی ——

ماہ رخ : افشاں —— (رندھی آواز سے) سانولی ان محبتوں کی امین ہے افشاں جو میرے اور عادل کے درمیان جنتی رعنائیاں بن کر بہہ رہی تھیں۔ اسے بھی معلوم ہو جانے دو کہ عادل کتنا جفا کار، کتنا دغا باز —— کتنا خود غرض اور فریبی انسان ہے ——

سانولی : (حیرت سے آنکھیں پھٹ جاتی ہیں، دل دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی ہے۔) یہ —— یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بانو —— عادل صاحب —— ایسے نہیں ہیں ——

ماہ رخ : (پتھرائے ہوئے انداز میں) اس نے ہم سب کو لوٹا ہے سانولی۔ بابا کے اعتماد میری محبت اور تمہارے بھروسے سبھی کو دھوکہ دیا ہے۔

سانولی : بانو! یہ کیسے کہہ رہی ہیں آپ ـــــ وہ ـــــ

ماہ رخ : (تلخی سے) وہ مغل حکومت کا جاسوس ہے سانولی۔ عادل اور مراد مخبری کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بابا بیٹے کے خون کے انتقام کی دھن میں ہیں اور وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

افشاں : (ماہ رخ کا چہرہ اپنی طرف کر کے) اسے کیا بتا رہی ہو۔

ماہ رخ : تو پھر کسے بتاؤں ـــــ افشاں ـــــ کسے بتاؤں (اس کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے)

افشاں : ہمیں ساری بات بابا سے کہہ دینی چاہیئے (افشاں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہے)

ماہ رُخ : ہاں ـــــ ساری بات بابا کو بتا دینی چاہیئے (دبے یقینی کے سے عالم میں) (ماہ رخ پھر بے تابی سے ہاتھ ملتے ہوئے ٹہلنے لگتی ہے)

افشاں : سانولی ـــــ جاؤ دیکھو بابا اس وقت کہاں ہیں۔

سانولی : کھانا کھا رہے ہوں گے ـــــ تھوڑی دیر پہلے ہی نادرہ ان کا کھانا مہمان خانے میں لے کر گئی تھی۔

افشاں : عادل اور مراد بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔

سانولی : جی ہاں۔ وہ کھانا اکٹھے ہی کھاتے ہیں۔

افشاں : (متفکر ہو کر) تو پھر!

سانولی : کھانا کھا کر آقا کچھ دیر کے لیے دارالمطالعہ میں جاتے ہیں۔

ماہ رخ : تم جا کر بابا کے وہاں جانے کا انتظار کرو ـــــ جب وہ وہاں ہوں تو ہمیں آکر اطلاع دینا (اپنا چکراتا ہوا سر تھام لیتی ہے) یا خدا ـــــ یہ کیا ہو گیا ـــــ کاش میں کچھ نہ سنتی ـــــ کچھ نہ دیکھتی ـــــ کہہ دو افشاں کہ عادل دغا باز نہیں ـــــ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔

افشاں : (کہنے کو جیسے کچھ باقی نہ رہا ہو ـــــ) ماہ رخ ـــــ سنبھلو ـــــ ذرا سنبھلو ـــــ (سانولی چلی جاتی ہے۔ ماہ رخ چند لمحے بڑی دیوانہ جذباتی حرکتیں

افشاں : یہ دھرتی ہماری اپنی دھرتی ہے۔ اس سے پیار کوئی دکھاوا نہیں۔

ماہ رخ : ہمیں والی سے دشمنی ضرور ہے۔ لیکن یہ دشمنی ذات تک محدود ہے۔ کوئی بیرونی طاقت ہماری غیرت اور ہماری آزادی کا سودا کرنے آئے تو ہم آہنی چٹان بن کر اس کے راستے میں کھڑے ہو جائیں گے۔

(اٹھ کر بے تابی سے ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہے —— افشاں حواس باختہ سی اسے دیکھتی رہی ہے)

ماہ رخ : (افشاں کے کندھے پر سر رکھ کر سسکتے ہوئے) میں کس کڑی آزمائش میں آ پھنسی ہوں عادل! عادل تو میری زندگی ہے افشاں! اس نے کیوں میرے اعتماد اور خلوص کو یوں مسل ڈالا — میرے صادق جذبوں کو۔ اتنا ظلم کرتے ہوئے اس کا دل پھٹ کیوں نہ گیا افشاں —— کیوں دھوکہ دیا میری پاک محبت کو — کیوں روند ڈالا۔

افشاں : (آنسو بہتے ہیں ——) ماہ رخ —— ہمت سے کام لو۔ میری مظلوم بہن ہمت سے کام لو ——

(ماہ رخ افشاں کے کندھے سے لگی سسکتی ہے۔ اس کے نازک وجود کو ہچکیوں سے جھٹکے لگنے لگتے ہیں۔ افشاں بھی روئے جاتی ہے ——)

ماہ رخ : (سر اٹھا کر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے) میرا سر چکرا رہا ہے۔ افشاں میں بابا سے کیوں کر سب کچھ کہوں گی —— میرا دل بیٹھ رہا ہے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے۔

افشاں : (اسے تھام کر بٹھاتے ہوئے) پانی لاؤں۔

ماہ رخ : (دیوانگی کے عالم میں) کیا یہ زہر میرے کانوں ہی میں ٹپکنا تھا۔ یہ ہلاکت آفرین حقیقت مجھ پر ہی منکشف ہونا تھی —— کاش میں نہ سنتی افشاں —— کاش میں نہ سنتی —— بابا سن لیتے ان دونوں کی باتیں۔

افشاں : (پریشانی سے) یہ بھی اچھا ہی ہوا —— جو بابا نے نہ سن لیں۔ ورنہ خدا جانے اسی وقت ان دونوں کا کیا حشر ہوتا ——

کرتی ہے۔ پھر افشاں اسے مسند پر بٹھا دیتی ہے۔ —— وہ خلاؤں میں دیکھتی سوچوں کے الجھاؤ میں ساکت ہو کر بیٹھی رہتی ہے —— پھر بڑبڑانے لگتی ہے)

ماہ رخ : عادل کی پریشانی کی اب سمجھ آئی ہے مجھے —— وہ اسی لیے پریشان تھا —— میرے پوچھنے پر بھی نہیں بتاتا تھا ——

افشاں : (اس کے قریب بیٹھتے ہوئے خواب ناک آواز میں) محبت اور فرض کی جنگ تھی نا ——

ماہ رخ : (آنکھیں سرخ اور چہرہ لال بھبوکا ہو جاتا ہے) محبت؟ کیا اب بھی تم یہ مقدس نام عادل کے نام کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہو۔

افشاں : اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے تم سے محبت ہے ——

ماہ رخ : (غصیلے لہجے میں) ایسا کہہ کر اب اس نازک جذبے کی توہین نہ کرو افشاں —— مجھے —— یہ کہنے دو —— کہ محبت اسے صرف اپنے فرض سے تھی۔ اپنے وطن اپنی حکومت سے تھی —— میری ذات پر محبت کی چھاپ لگا کر اس نے اپنے مقصد کو حل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔

افشاں : (سراسیمہ ہو کر) ماہ رخ۔ وہ اپنے کیے کی سزا پانے کو یہاں ٹھہر رہا ہے —— اسے اس کی محبت روک رہی ہے۔ ورنہ اپنے دوست کے ساتھ آج وہ بھی جا سکتا تھا ——

ماہ رخ : ہونہہ —— یہ اس کی خود غرضی ہے افشاں۔ شاید کوئی امید ابھی زندہ ہو گی —— کیا وہ سمجھتا ہے —— کہ سارا راز مجھ پر اگل کر وہ مجھ سے محبت کی بھیک مانگ سکے گا ——

افشاں : تو —— تو ——

ماہ رخ : ماہ رخ گولکنڈہ کی بیٹی ہے افشاں —— اس مقدس سرزمین کے ایک ذرے پر بھی آنچ نہیں آنے دی جا سکتی۔ (اک مستحکم عزم کے ساتھ) نہیں آنے دی جا سکتی آنچ ——

ماہ رخ : اس طرح حشر رک تو نہیں گیا۔

افشاں : ماہ رخ —— ذرا سنبھلو —— آرام سے بیٹھ کر دل جمعی سے پہلے سوچو۔
—— بابا کو سکون سے ساری باتیں بتانا —— کیا عجب وہ انہیں معاف ہی کر دیں۔

ماہ رخ : (تڑپ کر) افشاں —— یہ گولکنڈہ کی عزت و ناموس کا سوال ہے۔ اس کی آزادی کا سوال ہے۔ اس کی حرمت اور آبرو کا سوال ہے۔

افشاں : (گھبرا کر) تو کیا؟ کیا ——

ماہ رخ : ان دونوں کو آج رات گرفتار کر لینا ہوگا۔

افشاں : (چیخ کر) ماہ رخ!

ماہ رخ : صرف گرفتاری نہیں —— شاہی فوج کے حوالے کرنا ہوگا۔ سلطان کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔

افشاں : (دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے) ماہ رخ —— عادل تمہارا عشق ہے۔

ماہ رخ : عادل نے بھی عشق کو فرض پر قربان کر دیا ہے —— ماہ رخ قربانی میں بخیل نہ ہوگی۔

افشاں : ماہ رخ۔

ماہ رخ : اپنی پیاری اور آزاد ریاست کے لیے محبتیں قربان کی جا سکتی ہیں افشاں ——

افشاں : (روہانسی ہو کر) تم عادل کے بغیر کیسے جی سکو گی۔

ماہ رخ : (زہر خند) ماہ رخ تو اسی لمحے مر گئی تھی —— جب عادل بے نقاب ہوا تھا —— اب مجھے سہارا دو کہ میں اپنے وطن عزیز کی خاطر اس کڑی آزمائش سے گزر جاؤں —— افشاں چپ کیوں ہو۔ کیا تمہیں اپنے دیس کی آزاد فضاؤں سے پیار نہیں —— کیا اس کی چمکتی صبحیں اور دمکتی شامیں غلامی کے بار سے گہنا جانی چاہئیں ——

افشاں : ہرگز نہیں —— ہرگز نہیں۔

ماہ رخ : (اٹھتے ہوئے) تو آؤ چلیں بابا دارالمطالعہ میں آچکے ہوں گے۔

افشاں : (افسردگی سے) سانولی اطلاع دینے آئے گی۔

ماہ رخ : دیر ہو رہی ہے آؤ ہم بابا کے پاس خود ہی چلتے ہیں۔

افشاں : آؤ (ماہ رخ کے قریب آجاتی ہے۔ ماہ رخ کی حالت غیر ہے افشاں گھبرا کر اسے دیکھتی ہے)

ماہ رخ : (نڈھال سی ہو کر افشاں کے بازو پر جھکتی ہے) مجھے سنبھال لو افشاں، —— سنبھال لو۔ (گری جاتی ہے۔ سارا بدن کانپ رہا ہے) افشاں میں'

افشاں : ماہ رخ خدا کے لیے کچھ دیر لیٹ جاؤ۔ تمہارے حواس مختل ہیں۔ بابا کو کچھ بتانے سے پہلے ذرا پُرسکون ہو کر سوچنے کی کوشش کرو۔ اتنی بڑی قربانی دینے کی تمہیں ہمت بھی ہے یا نہیں۔ دیکھو تو کیا حال ہو گیا ہے۔ کچھ سکون پانے کی کوشش کرو پہلے۔

ماہ رخ : (قدرے سنبھل کر) سکون —— (زہر خند) سکون تو اب موت کی آغوش ہی میں ملے گا۔ باقی سوچنے کا وقت بالکل نہیں —— وقت گزر رہا ہے —— کام زیادہ ہے —— ایسا نہ ہو۔ وقت سانپ کی طرح نکل جائے اور ہم لکیر پیٹتے رہ جائیں —— تم جانتی ہو آج رات مراد یہاں سے فرار ہو رہا ہے ——

افشاں : بابا کو کچھ بتانے سے پہلے اچھا ہوتا۔ اگر تم عادل ——

ماہ رخ : (تیزی سے بات کاٹ کر) عادل سے ماہ رخ کے سارے رشتے ٹوٹ گئے ہیں —— کوئی ناطہ نہیں رہا —— ہر ڈوری کٹ گئی —— ہم دونوں نئے سرے سے اجنبی ہو چکے ہیں۔

افشاں : روح کے بندھن ٹوٹنا کچھ ایسا سہل نہیں ہوتا —— تم رک جاؤ۔ بابا کے پاس جانے سے پہلے سوچ لو۔

ماہ رخ : کیا تم مادرِ وطن سے غداری پر مجھے اکسا رہی ہو۔

(افشاں شرمندگی سے سر جھکا لیتی ہے۔ ماہ رخ کچھ کہنے کو ہے کہ سانولی

اندر آتی ہے)

سانولی : آقا دار المطالعہ میں تشریف رکھتے ہیں۔

افشاں : اکیلے ہی ہیں نا۔

سانولی : جی ہاں — عادل اور مراد صاحب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہیں۔

(افشاں بازو کے سہارے ماہ رخ کو لے جانا چاہتی ہے۔ لیکن اب وہ پُرعزم ہے خود ہی چل دیتی ہے۔ افشاں اور سانولی ساتھ جاتی ہیں —— سانولی دروازے میں رک جاتی ہے۔ وہ دونوں آگے بڑھ جاتی ہیں ——)

——— ٭ ———

(میر حیدر کا دارالمطالعہ ـــــ فانوسوں میں شمعیں جل رہی ہیں ـــ چاروں طرف نایاب اور قیمتی کتابیں ترتیب سے چنی ہیں۔ بیٹھ کر مطالعہ کرنے کے لیے نشستیں ہیں۔ آرام دِہ مسندیں ہیں۔ بابا اپنا بچوا اس لیے ایک مسند پر بیٹھے ہیں ـــــ ماہ رخ ان کے سامنے ہراساں کھڑی ہے۔ قدرے ہٹ کر افشاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بابا کو دیکھ رہی ہے بابا جوان دونوں کے سنسنی خیز انکشاف پر حیرت زدہ ہونے کی بجائے اپنے زانو پر پڑی کتاب پر ہاتھ مار مار کر قہقہے لگا رہے ہیں۔ دونوں حواس باختہ لڑکیاں ایک دوسرے کو خوف زدہ ہو کر دیکھتی ہیں۔ ماہ رخ آگے بڑھ کر بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے ـــ)

ماہ رخ: (حیرت اور خوف سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ) بابا ـــــ آپ ٹھیک تو ہیں نا ـــــ

بابا: بالکل ماہ رخ بیٹی ـــــ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ماہ رخ: تو پھر آپ میرے انکشاف پر ہنس کیوں رہے ہیں ـــــ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ طفلانہ حرکت ہے۔

افشاں: بابا ماہ رخ نے جو کچھ کہا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں نے ان کی گفتگو اپنے کانوں سے سنی ہے۔

ماہ رخ: وہ آپ کے کئی راز چرا چکے ہیں۔ خفیہ معلومات حاصل کر چکے ہیں بابا۔۔۔۔ اور آج رات مراد یہ سارا خزینہ لے کر گولکنڈہ کی سرحد پار کر رہا ہے۔

بابا: (پھر ہنس دیتا ہے) یہ خبر میرے لیے نئی نہیں بیٹی۔۔۔۔

ماہ رخ: (حیرت سے) تو کیا، تو کیا آپ جانتے ہیں۔ کہ عادل اور مراد جاسوس ہیں مغل حکومت کے جاسوس۔

بابا: (سنجیدہ ہو کر) ہاں۔۔۔۔ مجھے شک تو شروع ہی سے تھا۔ لیکن چند دن ہوئے میں نے اس شک کی تقویت پالی۔

ماہ رخ: آپ کو معلوم ہے۔ کہ عادل اور مراد جاسوس ہیں۔ مخبری کرتے یہاں آئے ہوئے ہیں؟

بابا: (اطمینان سے مسکراتے ہوئے) ہاں۔

ماہ رخ: تو آپ نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا۔

بابا: نہیں!

ماہ رخ: کیوں بابا، آپ نے انہیں ڈھیل کیوں دے دی۔ گرفتار کیوں نہ کر لیا۔

بابا: (ہنس کر) اس لیے کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔

(ماہ رخ اور افشاں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کی حد تک کھل جاتی ہیں۔۔۔۔)

ماہ رخ: (بابا کا کندھا جھنجھوڑ کر) بابا! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

بابا: ماہ رخ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔ اور نہ ہی یہ تمہارے سوچنے کی باتیں ہیں۔ افشاں بیٹی بہن کو لے جاؤ۔۔۔۔ اسے آرام سے سلا دو۔ بہت مضطرب نظر آ رہی ہے۔

ماہ رخ بابا یہ باتیں اگر میرے سوچنے کی نہیں۔ تو آپ کے سوچنے کی تو ضرور ہیں۔

افشاں: (سہمے انداز میں) ہاں بابا۔۔۔۔ مغل ہمارے دشمن ہیں اور عادل۔

بابا: (غضب ناک ہو کر) قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ ہمارا دشمن نہیں کیا؟

افشاں: (گھبرا کر) ہے بابا ——

ماہ رخ: والی ہمارا دشمن ہے —— لیکن اس دشمنی کی بھینٹ پوری ریاست کو نہیں چڑھایا جا سکتا بابا —— گولکنڈہ کی آزادی کا سودا اس دشمنی کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں بابا ——

بابا: میں نے جو سوچا ہے صحیح خطوط پر سوچا ہے —— عادل اور مراد مخبر ہیں میں انہیں جان بوجھ کر سہولتیں فراہم کر رہا ہوں۔ تاکہ وہ تیزی سے اپنا کام سرانجام دے سکیں —— (مجنونانہ انداز میں) یہ دونوں جیالے جانباز میرے شجاع کا انتقام لیں گے —— میری مضطرب اور بے چین روح کی تسکین کا سامان کریں گے۔ وہ قطب شاہ کی لاش میرے قدموں میں لا کر ڈالیں گے اور پھر (قہقہہ لگا کر) میں اس کی لاش کو ٹھوکروں سے مسخ کر دوں گا —— اس دن کو اس وقت کو اس لمحے کو میں کھینچ کر اپنے قریب لے آنا چاہتا ہوں ماہ رخ ——

ماہ رخ: (اپنے سوکھے حلق کو ہاتھ سے ملتی ہے) آپ کی سوچ کا کتنا غلط انداز ہے۔

بابا: (غضب ناک ہو کر) ماہ رخ ——!

ماہ رخ: بابا آپ اپنے انتقام کی خاطر گولکنڈہ سے غداری کر رہے ہیں۔ اپنی سرزمین —— مقدس سرزمین سے غداری ——

بابا: (غصے سے) افشاں اسے لے جاؤ یہاں سے (افشاں ڈر کر آگے بڑھتی ہے)

ماہ رخ: میں نہیں جاؤں گی بابا —— آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔ عادل اور مراد ہماری ریاست میں نقب زنی کے مجرم ہیں۔ انہیں سزا ملنی چاہیے۔ انہیں گرفتار کر کے حکومت کے حوالے کرنا چاہیے —— مراد آج رات کے پچھلے پہر سب کاغذات لے کر فرار ہو رہا ہے —— (بابا

کے زانو پکڑ کر ملتجی انداز میں) بابا ــــ خدا کے لیے بابا ــــ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے ــــ گولکنڈہ آپ کی اپنی ریاست ہے ــــ آپ کی اپنی آزاد ریاست بابا ــــ آزادی بہت بڑی نعمت ہے....

بابا: (ماہ رخ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری بچی ــــ میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے ــــ اس آگ کو بہہ جانے کا موقعہ ملا ہے ــــ اسے بہہ جانا چاہیئے۔ ورنہ تمھارا بابا اسی آگ میں بھسم ہو جائے گا۔

ماہ رخ: اس آگ کو بجھانے کا یہ طریقہ نہیں بابا ــــ آپ مغلوں کی طاقت سے آگاہ ہیں۔ بیجاپور ایک سال تک مقابلہ کر سکا ــــ پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ ہماری فوجی حیثیت تو بیجاپور سے بھی کمتر ہے۔ اس سیلاب کے آگے کیونکر ٹھہر سکیں گے۔

بابا: (مسکرا کر) یہی تو میں چاہتا ہوں بیٹی ــــ

ماہ رخ: بابا ــــ آپ تباہی کو دعوت دے رہے ہیں ــــ گولکنڈہ تباہ ہو جائے گا۔ آزادی سلب ہو جائے گی۔ جنگ تباہی لاتی ہے بابا۔ ہزاروں گھر تباہ ہو جائیں گے ــــ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے ــــ فاتح قوم اپنے رعب کا سکہ بھی جس طرح جماتی ہے آپ جانتے ہیں۔ بیجاپور کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

بابا: (ہنس کر ــــ لاپرواہی سے) میں خود تباہ ہو چکا ہوں ــــ اس لیے مجھے کسی کی تباہی کی پرواہ نہیں ــــ میری آزادی سلب کر لی گئی ہے ــــ کیا میں اس جاگیر میں نظر بند نہیں ہوں۔ میری آزادی نہیں چھینی گئی کیا؟

ماہ رخ: یہ سب اک ظالم، جابر اور عیاش حکمران کا عمل ہے بابا ــــ

بابا: (غصے سے) اس کی اسے قرار واقعی سزا بھی ملنی چاہیئے۔

ماہ رخ: سزا حکمران کو ملنی چاہیئے ——— رعایا کو نہیں ——— اور آپ جانتے ہیں ——— جنگ کی صورت میں تباہی بربادی صرف حکمران پر نہیں آئے گی۔ گولکنڈہ کے سینے پر آگ و خون کا سیلاب بن کر بہے گی۔

بابا: مجھے قطعاً پرواہ نہیں۔

ماہ رخ: (چہرہ لال بھبوکا ہو جاتا ہے) بابا!

بابا: (آنکھیں بند کر کے اپنی دھن میں) آندھی، زلزلے اور طوفان سب تخریبی عناصر ہیں لڑکی ——— اور انتقام ——— ! انتقام بھی جذبات کی آندھی ہے زلزلہ ہے طوفان ہے۔ اس کی زد میں جو بھی آجائے مجھے پرواہ نہیں۔

ماہ رخ: (چیخ کر) بابا! (افشاں لرزہ براندام ہے)

بابا: افشاں ——— اسے لے جاؤ یہاں سے ——— سلا دو جا کر۔

ماہ رخ: (افشاں کا ہاتھ جھٹک کر) بابا آپ گولکنڈہ کی مٹی سے غداری کر رہے ہیں۔

بابا: تمھارے سمجھانے کی ضرورت نہیں ——— تباہی آنی ہے ——— اور ضرور آئے گی ——— میرے سینے کے الاؤ صرف اسی طور ٹھنڈے ہو سکتے ہیں۔

ماہ رخ: یہ خود غرضی ہے بابا ——— اپنی ذات کے لیے اس تباہی کو نہ بلایئے۔

بابا: (خوفناک ہنسی) تباہی ضرور آئے گی۔

ماہ رخ: (جوشیلے عزم کے ساتھ) نہیں آئے گی ——— میں وقت کے چہرے سے وہ لمحہ نوچ لوں گی جو تباہی کا نقطۂ سیاہ بن کر ہماری ریاست کے مقدر پر پھیل جانے کو ہے۔

بابا: (ہنس دیتا ہے) بہت جذباتی ہو رہی ہے لڑکی ——— اٹھو ———

(اسے کھڑا کرے۔) جاؤ ——— میری بیٹی ——— یہ باتیں تمھارے سوچنے کی

نہیں ہیں۔

ماہ رخ: (بابا کی بوڑھی آنکھوں میں تیز نظروں سے گھورتے ہوئے) تو آپ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گے۔

بابا: تمھارے بابا کا عزم مونگے کی چٹان ہوتا ہے بیٹی ____

ماہ رخ: آپ ان دونوں کو گرفتار نہیں کریں گے!

بابا: نہیں ____ بلکہ بہت سے اور اہم راز ان کے حوالے کر کے ____ انہیں اس خفیہ راستے سے جو سیدھا کرناٹک کی طرف جا نکلتا ہے۔ ساری سہولتیں بہم پہنچا کر وہاں سے نکال دوں گی ____ انہیں راستہ طے کرنے میں بھی کوئی دھڑکا نہیں رہے گا۔

ماہ رخ: (قہر آلود نظروں سے بابا کو دیکھتے ہوئے) ہوں!

بابا: افشاں ____

افشاں: (سہمے انداز میں) جی بابا ____

بابا: ہماری لاڈلی کو لے جاؤ اور آرام سے بستر پر لٹا دو ____ آج ہم اتنے خوش ہیں کہ اس کی گستاخانہ گفتگو بھی معاف کرتے ہیں ____ جاؤ کنیزوں سے کہو ____ اس کے سر میں روغن گل کی مالش کریں یہ بہت پریشان ہو رہی ہے (اٹھ کر ٹہلتے ہوئے) بہت جذباتی بچی ہے۔ (رک کر اسے دیکھتے ہوئے) لیکن ہم جانتے ہیں ____ جب قطب شاہ والئ گولکنڈہ کی خون میں نہائی ہوئی لاش ہمارے قدموں میں ٹھوکروں سے مسخ ہونے کے لیے لائی جائے گی ____ تو ہماری بیٹی خوشی سے پاگل ہو جائے گی ____ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسے بھی شجاع سے اتنا ہی پیار ہے جتنا ہمیں ____ شاید ہم سے بھی زیادہ ____ اور یہ بھی انتقام کے لیے اتنی ہی بے قرار ہے جتنے ہم ____

ماہ رخ: (شعلہ جوالہ بن کر) میں انفرادی خوشی کے لیے اجتماعی مفاد کو
قربان نہیں کر سکتی ـــــ نہیں کر سکتی ـــــ (غصے سے)
نہیں کرنے دوں گی۔

(غصے سے بھنائی وہ کمرے سے نکل جاتی
ہے ـــــ افشاں بھی اس کے پیچھے جاتی ہے ـــــ بابا
پیار سے پگلی کہہ کر مسکراتے ہوئے پیچوان کی نے منہ میں
دبا لیتا ہے ـــــ)

(آج آدھے چاند کی نامکمل روشنی سوگوار سی ہے۔ سینۂ چرخ پر پھیلے ہوئے ابر کے ٹکڑے کبھی کبھی اس مضمحل روشنی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں ـــــ ہوا سہمی ہوئی چل رہی ہے ـــــ پھیکی پھیکی چاندنی میں میر حیدر کی رہائش گاہ کسی پرانے مدفن کی طرح نظر آ رہی ہے۔ ہر طرف گہرا اور معنی خیز سکوت ہے ـــــ بابا کے کمرے کی روشنیاں گُل ہو چکی ہیں۔ مراد بھی سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جا چکا ہے۔ کھلے آسمان تلے او نگھتے شاداب چمن میں ایک بڑے سے پتھر پر عادل بیٹھا بربط کے تاروں سے سوز و گداز کی لہریں بکھیر رہا ہے اسے ماہ رخ کا انتظار ہے۔ جو ابھی تک نہیں آئی۔ رات ڈوبتی جا رہی ہے آج کی اہم رات)

عادل: (بربط الگ رکھ کر پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہے) ماہ رخ ـــــ آج نہیں آئی شاید ـــــ کل ناراض ہو گئی ـــــ یا خدا مجھے ہمت دے ـــــ میں آج مراد کو رخصت کر کے اپنے فرض سے سبک دوش ہو سکوں ـــــ پھر ـــــ پھر میں ماہ رخ کے حضور اپنے آپ کو بےنقاب کر دوں ـــــ وہ جو چاہے مجھے سزا دے چاہے تو ٹھکرا دے، چاہے تو اپنی مقدس محبت کے لہراتے آنچلوں میں چھپا لے۔ میں ہر صورت حال

کے لیے پورے عزم سے تیار ہوں ___

(قدموں کی دبی دبی آہٹ پر گھوم کر دیکھتا ہے ___ ماہ رخ آ رہی ہے ___ وہ والہانہ استقبال کو اٹھ کر اس کے سامنے آجاتا ہے)

عادل: ماہ رخ! آج اتنی دیر لگا دی۔

ماہ رخ: (جس کے چہرے پر تھکن کا غبار اور عزم کا آہنی پن ہے۔ مسکرا کر اپنے جذبات کو چھپاتی ہے) بہت راہ دیکھی؟

عادل: تین بے رحم گھنٹے گزر گئے ہیں۔ جب کہ تم آگاہ ہو ___ کہ تین لمحے بھی میرے لیے کتنے اذیت دِہ ہیں۔

ماہ رخ: بربط ساتھ نہیں تھا؟

عادل: میری انگلیاں بجاتے بجاتے شل ہو گئیں ___ کیا یہ آواز تم تک نہ پہنچ رہی تھی۔ میں تو مایوس ہو کر جا رہا تھا ___ ابھی ___

ماہ رخ: (ہنستی ہے) وہ ___ رات بھر انتظار کے وعدے ریت کے گھروندے تھے؟

عادل: رات کیا؟ ___ میں عمر بھر تمہارا انتظار کر کے بھی نہیں تھک سکتا ماہ رخ ___ لیکن (کچھ کہتے ہوئے رک جاتا ہے)

ماہ رخ: (طنزیہ انداز میں) لیکن آج کچھ ضروری کام تھا ___

عادل: (طنز نہ سمجھتے ہوئے) تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ماہ رخ۔ ہاں مجھے آج ضروری کام ہے۔

ماہ رخ: (اطمینان سے) لیکن آج مجھے کوئی کام نہیں عادل ___ میں سارے جھمیلے نپٹا آؤں ___ آج سحر کی خمار آلود آنکھیں بھی ہم دونوں کو یہاں اکٹھا دیکھیں گی۔

عادل: (گھبرا کر) آج ___ آج ___ میں نے کہا نا مجھے ضروری کام ہے۔

ماہ رخ: (دیوانگی سے مسکرا کر) آج رات ماہ رخ کی زندگی میں پہلی اور آخری بار آئی ہے عادل آج میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی ___ تم بربط

بجاؤ گے ـــــ میں روح بن کر جھوموں گی ـــــ تم ـــــ

عادل: پہلی اور آخری رات کیوں ماہ رخ ـــــ؟ ایسی ہزاروں راتیں۔ لیکن تم یوں بہکی بہکی باتیں کیوں کرنے لگیں۔ تم بڑی تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ جاکر آرام کرو ـــــ اور تمھیں کہا نا۔ کہ مجھے کچھ ضروری کام بھی ہے۔

ماہ رخ: ماہ رخ کی قربت سے بھی زیادہ ضروری؟

عادل: تم ـــــ تم نہیں سمجھتیں ـــــ

ماہ رخ: (بہکے ہوئے شرابی کی طرح) تم ہی سمجھا دو نا ـــــ

عادل: (منہ موڑ کر پریشانی سے ہاتھ ملتا ہے) ماہ رخ۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔

ماہ رخ: (اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) تو میں چلی جاؤں؟

عادل: (رخ پلٹ کر) کچھ دیر بعد ـــــ ابھی نہیں ـــــ

ماہ رخ: میں تو رات بھر ـــــ اس فسوں خیز سمے میں محبت کی خوشبو بن کر تمھارے وجود کے گرد بکھری رہنا چاہتی ہوں عادل ـــــ کام محبت کے ان جان دار لمحوں پر قربان کیے جا سکتے ہیں ـــــ کام صبح ہو جائیں گے۔

عادل: (پھر گھبرا جاتا ہے) مجھے مراد سے کچھ کام ہے۔

ماہ رخ: کام کی اہمیت ماہ رخ سے بھی زیادہ ہے۔

عادل: (پریشان سے پریشان تر ہو جاتا ہے) آؤ ماہ رخ۔ اس پتھر پر بیٹھیں۔

ماہ رخ: بربط بجاؤ گے؟

عادل: نہیں باتیں کریں گے۔ دل کی باتیں۔

ماہ رخ: دل کی باتوں کے لیے تو ایک عمر بھی کافی نہیں۔ اور تم آج رات بھی مجھے پوری نہیں دے سکتے۔

عادل: آج تم کیوں بضد ہو۔

ماہ رخ: دل یہی چاہتا ہے ـــــ (ملول آواز میں) مستقبل کے سپنے ہیں

ہمارے لیے خدا جانے کیا پوشیدہ ہے —— میں وقت کی اس دھارا پر بے خبر ہو کر بہہ جانا چاہتی ہو عادل جو خدا جانے کن اندھیروں میں ڈوبنے کے لیے بہہ رہی ہے۔

عادل: تمہاری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔ بہت مایوسی کی باتیں کر رہی ہو۔

ماہ رخ: (ڈوب کر) میں مایوس نہیں ہوں عادل —— میں عزم و استقلال کی زندہ تصویر ہوں۔ میں گوبکنڈہ کی آہنی ارادے رکھنے والی جانباز بیٹی ہوں۔

عادل: (پریشاں ہو کر اسے دیکھتا ہے پھر پتھر پر بیٹھتے ہوئے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیتا ہے) ماہ رخ آج۔ تم خدا جانے کیسی باتیں کر رہی ہو۔

ماہ رخ: (اس کے قریب بیٹھتے ہوئے) تم انتہائی زیرک —— انتہائی ذہین انسان بھی میری باتیں نہیں سمجھ سکتے —— (اپنے آپ سے) واقعی۔ کوئی کسی کو نہیں سمجھ سکتا —— انسان خارجی عوامل کے سہارے ایک دوسرے کے خیالات کا تعین کر سکتا ہے۔ باطنی طوفانوں سے آگاہی کبھی نہیں ہو سکتی۔

عادل: (بے یقینی اور حیرت سے اسے دیکھتا ہے) کیا تمہیں علم ہو گیا ہے کہ

ماہ رخ: (ہنستے ہوئے) کہ تم اپنی محبت میں ایمان دار نہیں۔

عادل: یہ میرے جذبوں کی توہین ہے۔

ماہ رخ: (ہنستے ہوئے) محبت بڑا نرم و نازک جذبہ ہے عادل —— (بے اختیارانہ) یہ تو ذرا سے سائے سے بھی گہنا جاتا ہے —— تم نے تو مجھ سے اپنا آپ بھی پوشیدہ رکھا ——

عادل: (عاجز آ کر) ماہ رخ —— تم کل والی باتوں سے ناراض معلوم ہوتی ہو۔ بخدا —— آج رات گزر جانے دو —— کل میں تمہیں سب کچھ بتا دونگا سب کچھ —— کل سب کچھ ——

ماہ رخ: (متانت اور سنجیدگی سے) آج کیوں نہیں؟

(عادل بے بسی سے پھر دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیتا ہے۔ ماہ رخ کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سی سختی ہے ــــــ وہ خاموش بیٹھی رہتی ہے ــــ چند لمحے گزر جاتے ہیں ــــ پھر رات کے سناٹے میں دور سے گھوڑوں کے بھاگنے کی صدا آتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ قریب آجاتی ہے ــــ ماہ رخ سختی سے اپنا گریبان پکڑ لیتی ہے۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ عادل جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے ــــــ)

عادل: بے شمار گھوڑوں کے ٹاپ ــــــ

ماہ رخ: (چہرہ سفید پڑ جاتا ہے۔ عادل کے بازو کو مضبوطی سے تھام لیتی ہے) عادل! (آواز ڈوب جاتی ہے) ــــــ

عادل: (آوازیں قریب پہنچ رہی ہیں ــــــ ماہ رخ کو سنبھالتے ہوئے) گھبراؤ نہیں ماہ رخ۔ شاید کوئی لشکر ادھر سے گزر رہا ہے۔

ماہ رخ: اس کے کندھے سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے) محبت اک آفاقی جذبہ ہے۔ روحانی قدر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن فرض اس سے بھی شاید مقدس جذبہ ہے ــــــ جو یہ آفاقی جذبہ اور روحانی قدر اس پر قربان کر دی جاتی ہے۔

عادل: اس کی طرف ہراساں ہو کر دیکھتا ہے۔ پھر اسے پیار سے الگ کر کے) یقیناً تم میرے فرض سے آگاہ ہو چکی ہو ــــــ (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) میرا ــــــ میرا فرض ــــــ

ماہ رخ: (اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر) اور ــــــ ابھی ــــــ چند لمحوں بعد تم میرے فرض سے بھی ــــــ آگاہ ہو جاؤ گے ــــــ

عادل: (ماہ رخ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے) کیا مطلب؟

(گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں رہائش گاہ کے چاروں طرف

سے آتی ہیں)

ماہ رخ: (دونوں ہاتھوں میں عادل کا چہرہ تھام کر اس کی حیران آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔ بڑے کرب سے مسکراتے ہوئے) اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی قابل احترام ہیں عادل —— کہ ہم نے اپنے اپنے فرض سے آنکھیں نہیں پھیریں۔

عادل: (سخت اضطراب میں) تم کیا کہہ رہی ہو —— میں سمجھا نہیں ——

ماہ رخ: (اسی دیوانہ انداز میں) تم نے فرض ادا کیا —— میں نے بھی فرض ادا کیا —— باقی رہے دل کے معاملے —— تو بعض دل شاید قدرت نے جلنے کے لیے ہی بنائے ہیں (قدرے رک کر) عادل! —— میں نے تمہیں —— محبت کی شدتوں اور عشق کی انتہاؤں تک چاہا ہے۔

عادل: ماہ رخ (اسے بازوؤں میں سمیٹ لیتا ہے ——)

ماہ رخ: (چند لمحے بے سدھ سی ہو جاتی ہے ——) عادل ۔ (بے اختیار ہو کر رو دیتی ہے)

(گھوڑوں کے آتشیں ٹاپ آواز پیدا کر رہے ہیں۔ تلواروں کی جھنکار کے ساتھ ہی کچھ مبہم اور غیر واضح سی آوازیں ابھرتی ہیں ——)

عادل: (پریشان ہو کر) ماہ رخ یوں لگتا ہے —— کہ سوار رہائش گاہ کے گرداگرد بکھر گئے ہیں۔

ماہ رخ: (اس کے سینے سے سر اٹھاتے ہوئے) خدا حافظ عادل۔ (جانے لگتی ہے آنکھیں نم ہیں)

عادل: ماہ رخ —— رکو —— ذرا ٹھہرو۔

ماہ رخ: (پلٹے بنا) وقت ہو چکا —— شاہی فوج پہنچ گئی ہے —— ہماری رہائش گاہ محاصرے میں ہے۔

عادل: (چیخ کر) ماہ رخ ـــــ

(ماہ رخ پلٹ کر نہیں دیکھتی۔ عادل پوری طرح کچھ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ عمارت کی طرف بھاگتا ہے ـــــ شاہی فوج کے کئی سپاہی ننگی تلواریں لہراتے چاروں طرف سے لپکتے ہیں۔)

(میر حیدر کی سب سے بڑی نشست گاہ۔ زرہ بکتر پہنے سروں پر خود جمائے سپاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ عادل اور مراد پابہ زنجیر سر جھکائے سب کے درمیان کھڑے ہیں۔ میر حیدر غصے سے دیوانہ ہو رہے ہیں۔ سالارِ اعلیٰ ان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی میان میں تلوار لٹک رہی ہے۔ بابا کے کمر بند کے ساتھ خنجر ہے۔ بابا کے گھیر دار کرتے نے خنجر کو چھپا رکھا ہے۔ سپاہی تلواریں سونتے کھڑے ہیں۔ ان کے چہروں پر تبسم ہے۔ سامنے والے دروازے کے پس پردہ ماہ رخ افشاں کے بازوؤں میں سسک رہی ہے۔ حویلی کے سب خدام اور کنیزیں شاہی فوج کی زیر حراست ہیں)

سالار: (میان پہ ہاتھ رکھتے ہوئے) میر حیدر —— آپ کی بہادر اور جانباز بیٹی ہمیں بر وقت مطلع نہ کرتی —— تو یہ دونوں آج ہمارے بیش قیمت راز لے کر فرار ہو جاتے۔

(عادل اور مراد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ مراد حیران نظر آتا ہے۔ اور عادل کو جیسے سکتہ ہو جاتا ہے ——)

میر حیدر: (غضب ناک ہو کر) تو یہ اطلاع تمہیں ماہ رخ نے بہم پہنچائی۔

سالار: (احترام سے سر جھکا کر) ہم گولکنڈہ کی اس عظیم بیٹی کو سلام کرتے ہیں۔

میر حیدر: (پارے کی طرح مضطرب) ماہ رخ کی ایسی جرأت۔ ہماری راہ میں حائل ہونے کی گستاخی۔

سالار: (حیرانگی سے) میر حیدر۔ کیا آپ کو ان دشمنوں کو گرفتار کروا کے خوشی نہیں ہوئی۔

میر حیدر: میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میں ان دونوں کی سرگرمیوں سے لاعلم نہیں تھا۔ (عادل اور مراد دونوں حیرت سے بابا کو دیکھتے ہیں۔)

سالار: (ایک قدم آگے بڑھا کر) تو گویا آپ نے دانستہ انہیں پناہ دی۔

میر حیدر: ہاں (عادل اور مراد دونوں پھر حیرت سے بابا کو دیکھتے ہیں۔)

سالار: (حیرت سے) آپ ان کے ساتھ سازش میں شریک تھے۔

میر حیدر: میرا جواب نفی میں نہیں ہے۔ (مراد اور عادل پھر بیقرار ہو کر بابا کی طرف دیکھتے ہیں)

سالار: آپ میری حراست میں ہیں۔

میر حیدر: (خشم ناک لہجے میں) میں جانتا ہوں۔

سالار: (دو سپاہیوں سے) رجب خاں اور سرور علی زنجیریں لاکر میر حیدر کو پہنا دو۔
(پس پردہ ماہ رخ چیخ اٹھتی ہے۔ بابا ——) عادل بیقراری سے ادھر دیکھتا ہے۔

میر حیدر: (گرفتاری کے لیے ہاتھ پیش کرتے ہوئے) سالار۔ تم مجھے زنجیریں پہنا سکتے ہو۔

ماہ رخ: (چیخ کر) بابا —— میرے بابا ——

(سب دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جس کا پردہ ہٹا ہوا ہے اور ماہ رخ افشاں کے ہاتھوں سے نکل کر بابا تک آنے کی جدوجہد کرتی نظر آتی ہے —— سانولی بھی اسے تھامنے کی کوشش کر رہی ہے۔)

میر حیدر: (آنکھوں سے شعلے لپکتے ہیں۔ ماہ رخ کو دیکھ کر چہرہ سرخ ہو جاتا ہے وہ مضطرب ہو کر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر سالار کی طرف دیکھتا ہے)

میں گرفتاری سے پہلے اپنی بیٹی سے ملنے کی اجازت چاہوں گا (جوش سے) وہ سامنے ہی کھڑی ہے۔

سالار: آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔

(میر حیدر برق رفتاری سے ادھر جاتا ہے۔ سب کی نظریں ادھر اُٹھ جاتی ہیں۔ عادل کی مجبور بے بسی دید کے قابل ہے۔ ماہ رُخ تڑپ کر افشاں کے بازوؤں سے نکل کر روتے ہوئے بابا سے لپٹ جانے کو دوڑتی ہے)

ماہ رُخ: (ہچکیاں لیتے ہوئے) بابا!

میر حیدر :(آنکھوں سے جیسے خون رِس رہا ہے۔ چہرے پر خشونت ہے۔ دانت
پیس کر) تو تم نے یہ سارا گل کھلایا۔

ماہ رُخ : (روتے ہوئے) ہاں بابا ـــ اک محبِ وطن بیٹی کے لیے اس کے
سوا کوئی چارہ نہ تھا ـــ کہ خود جاکر سالار کو مطلع کرے۔ مَیں نے اپنا فرض
اَدا کیا ہے بابا۔ (افشاں بھی روتی ہے اور سانولی بھی)

میر حیدر : (آنکھوں میں آگ اُبھرتی ہے۔ چہرہ خوفناک ہو جاتا ہے ـــ) تو
تونے تو میرے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی ہے۔

ماہ رُخ : (روتے ہوئے) یہ میرا فرض تھا بابا۔

میر حیدر : یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راہ میرے انتقام کی راہ ہے۔ (گرجتا ہے)
ناہنجار لڑکی ـــ تُونے بنا بنایا کام یوں بگاڑ دیا

ماہ رُخ : (سہم کر) بابا ـــ!

میر حیدر : (خنجر نکال کر) میرا انتقام ادھورا رہ جائے اور مَیں تجھے چھوڑ دوں۔
(خنجر لہراتا اور پھر ماہ رُخ کے سینے میں اُتار دیتا ہے) ہونھ۔

عادل : (تڑپتی ہوئی چیخ) با ـــ با ـــ (زنجیریں توڑ کر دروازے کی طرف
بھاگنے کی کوشش میں اوندھے مُنہ گرتا ہے۔ ماتھے سے خون بہنے لگتا ہے۔
ماہ رُخ کی کربناک چیخ افشاں اور سانولی کی چیخوں میں گُم ہو جاتی ہے)

میر حیدر : (گرجتے ہُوئے خوفناک آواز میں) میرے انتقام کی راہ میں حائل ہونے
کی تجھے جُرأت کیسے ہوئی ـــ ناہنجار لڑکی ـــ

(نشست گاہ میں شور مچ جاتا ہے۔ مُراد بے بسی سے تڑپتا ہے۔ اور زخمی عادل
کی دیوانہ وار چیخیں ماہ رُخ کے الفاظ میں ڈھل رہی ہیں۔ سالار اور سپاہی
حیرت سے سارا منظر دیکھ رہے ہیں ـــ سالار بالآخر آگے بڑھتا ہے ـــ
اِس دروازے کی طرف جاتا ہے۔ جہاں افشاں اور سانولی لہو میں نہائی ماہ رُخ
پر جھکی تڑپ رہی ہیں۔ اور میر حیدر بُت کی طرح کھڑا ہے۔ سالار ماہ رُخ پر

ایک نظر ڈالتا ہے۔ پھر میر حیدر کا کندھا جھنجھوڑتا ہے ـــــ)

سالار : یہ کیا ظلم کیا میر حیدر ـــــ گولکنڈہ کی عظیم بیٹی تو تعظیم کے لائق تھی۔ آپ نے ـــــ (اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے ہی حیدر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ اور پھر اس کے قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں ـــــ سالار سپاہیوں اور مُراد کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر سالار ادب سے آگے بڑھتا ہے تعظیم سے جھکتا ہے اور ماہ رُخ پر اس کا دوپٹہ ڈال کر سیدھا کھڑا ہو کر سپاہیوں کو حکم دیتا ہے ـــــ

سالار : (بارُعب آواز میں) گولکنڈہ کی اس بہادر بیٹی کو تعظیم دی جائے۔ (سپاہی سیدھے کھڑے ہو کر سر جھکاتے اور اپنی تلواریں زمین کی طرف کر دیتے ہیں۔ عادل کی تڑپ اور بابا کے قہقہے سوگوار جمود کو توڑتے رہتے ہیں)۔

(رضیہ بٹ)

خوبصورت اور دلکش کتابیں

رابی	رضیہ بٹ
مَیں کون ہوں	رضیہ بٹ
رانگ نمبر	رضیہ بٹ
زندگی	رضیہ بٹ
ناجیہ	رضیہ بٹ
گُل بانو	رضیہ بٹ
آئیڈیل	رضیہ بٹ
ثمینہ	رضیہ بٹ
سارہ	رضیہ بٹ
رفاقتیں کیسی	رضیہ بٹ
ریشم	رضیہ بٹ
رُوپ	رضیہ بٹ
فاصلے	رضیہ بٹ
آئینہ	رضیہ بٹ
شائنہ	رضیہ بٹ
شیخو	رضیہ بٹ
ماہ رُخ	رضیہ بٹ
کمانڈو۔ ۷ حصے	اے حمید
قلوپطرہ کے دیس میں	علی سفیان آفاقی
پیرس کی گلیاں	علی سفیان آفاقی

خانہ بدوش کے خطوط	اے حمید
برف باری کی رات	اے حمید
ویران جزیرے	اے حمید
چائے والا	اے حمید
سیاہ پھول	اے حمید
آدھی رات کا شہر	اے حمید
جھیل اور کنول	اے حمید
دھوپ اور شگوفے	اے حمید
ڈربے	اے حمید
جنگل روتے ہیں	اے حمید
جاپان کی ڈمپل	اے حمید
زیتون کی وادی	اے حمید
بارش اور بالکونی	اے حمید
چاند پھر نکلے گا	اے حمید
گلاب کی ٹہنی	اے حمید
کمانڈو (سات حصے)	اے حمید
شکار بیتی	قمر نقوی
شکار نامہ	قمر نقوی
امریکہ میں شکار	قمر نقوی

رضیہ بٹ کی خوبصورت اور دلکش کتابیں

رانگ نمبر
رابی
رفاقتیں کیسی
زندگی
شیخو
ریشم
میں کون ہوں
ماہ رخ
روپ
ناجیہ
فاصلے
آئینہ
گل بانو
ثمینہ
آئیڈیل
شائینہ
سارہ

مقبول اکیڈمی
MAQBOOL ACADEMY
مقبول اکیڈمی